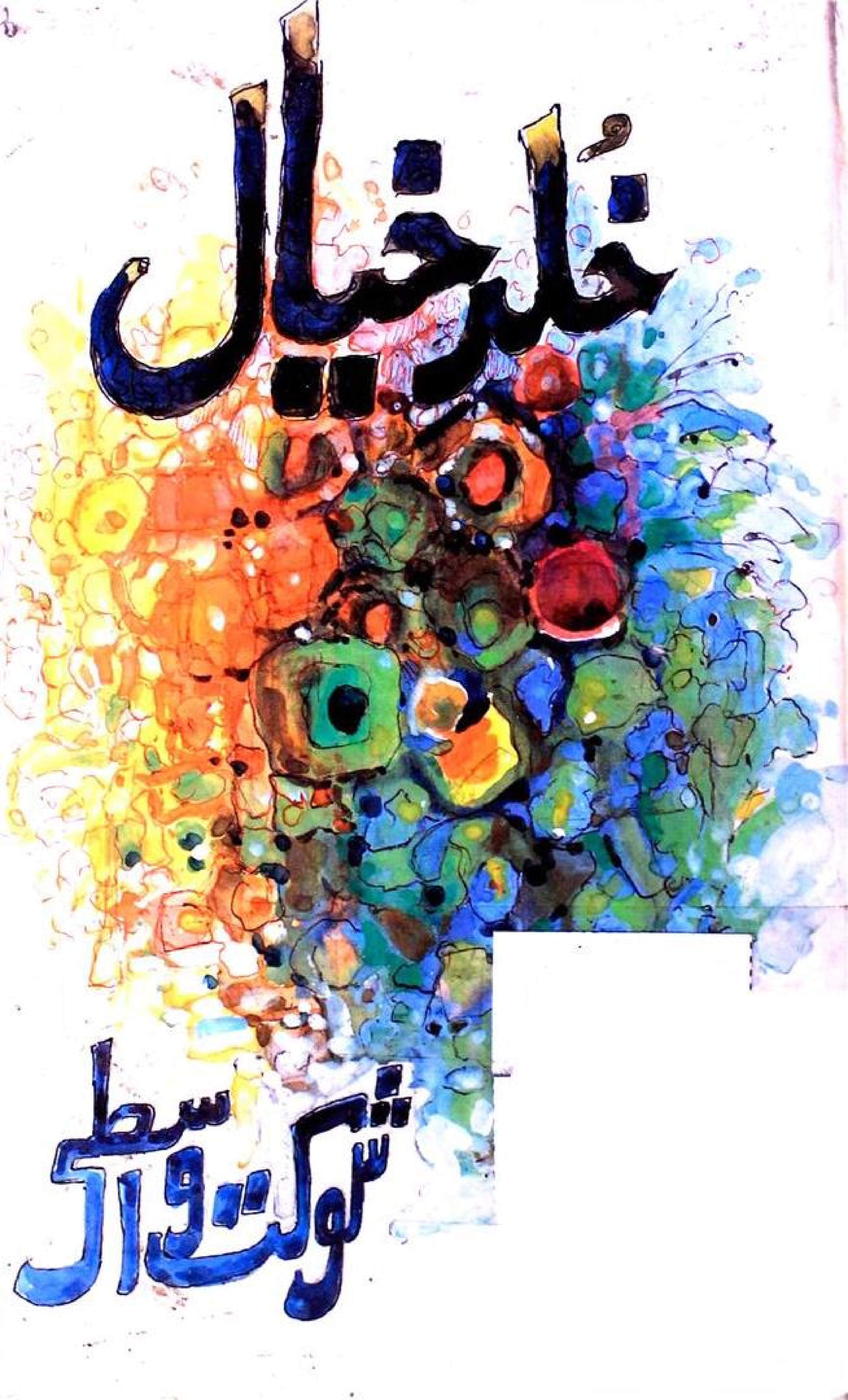
نخلِ خیال
شوکت واسطی

خُلدِ خیال

○

غزلیات

شوکت واسطی

سنہ ۱۹۹۳ء اشاعت

ناشر :

بزمِ علم و فن پاکستان

اھتمام :

واسطی پرائیویٹ (لمیٹڈ)

پوسٹ بکس : اسلام آباد — پشاور

۱۹۳۵ — ۳۵۵

○

مطبع :- فنون پریس لاھور

قیمت ۲۵۰ روپے

ادب ادب کے لیے ہے کہ زندگی کے لیے
مری بیاض اٹھا لو تو فیصلہ ہو جائے

اِنتساب

ہم دمِ دیرینہ

صادقؔ نسیم

کے نام —

فہرست

○

مقدمہ

آوازِ دوست

امتنان

○

حمد ــــ نعت

ابتدائیہ

○

غزلیات

قطعات ــــ ابیات

نفسِ مضمون ــــ غمِ جاں، غمِ جاناں، غمِ جہاں

حرفِ صرف آئے ہم آہنگ ہوئے معنیٰ و لفظ
زیبِ تنِ فن نے کیا عمدہ عبارت کا لباس
سلکِ ہر سطر ہیں مشاطہ گری سے بندھے
معدنِ فکر سے اِلہام کے لاکر الماس
با ہمہ سعیِ قلم، با ہمہ جولانیِ طبع
شوکت اب تک وُہی مُحتاجِ بیاں ہے اِحساس

مقدمہ

شاعری پر فلسفیانہ، عالمانہ، ادیبانہ موشگافی، نکتہ سنجی، تبصرہ آرائی ہر زاویئے رویئے نظریئے سے آسان ہے ـــــ لیکن غزلیات کی کوئی کلیات میرے نزدیک سراسر معروضی تخلیق ہو، بعید از امکان ہے۔ یہ بیشتر وارداتی کیفیاتی ہوتی ہے، یا پھر اپنی صنف کی رعایت سے وہ ایسی ہونی چاہیئے۔ تغزل کا خمیر جذبات سے اُٹھا ہے، اسلوب اس کا متعیّن اور لفظ گری کی مخصوص نوعیت طے۔ اب اگر اس میں واقعات کا بیان بھی ہو تو انہی عناصر سے ترتیب پائے گا۔ ملائمت اس صنف کے لہجے کی تہذیب ہے۔ دیگر اجزا زبان کی شستگی اور اظہار کی شائستگی ہیں۔

غزل میں چونکہ تسلسلِ خیال کی شرط نہیں لہٰذا قافیے ردیف کی پابندی کے ساتھ بیک وقت بلا تکلف جو کیفیت جی میں آئے، موزوں پیرائے میں رنگ برنگ پھولوں کی طرح اس کی لڑی میں پرو لو، سمو لو۔ ہیئت کے اعتبار سے بے شک ایسے کلام پر اس صنفِ سخن کا اطلاق ہو گیا۔ تاہم وہ جو ایک لطافت اس کے مزاج کا خاصہ ہے اگر اس میں سے مفقود ہے تو پھر ایسے جانیئے کہ پتھر کی تراش خراش سے، نک سک میں ٹھیک ٹھاک ایک خوش نما بُت تو بن گیا، لیکن اس میں احساس نہیں، جان نہیں۔ معمول کا لُطف لے لو! دلچسپی کا سامان فراہم ہوا ـــــ لیکن دلگدازی کا وجدان کہاں باہم ہوا۔ پس آئے دن پے در پے، غزلیات کے دیوان ظاہری تلازمات کے تتبع میں منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ انہیں غزل کے مزاج کی کسوٹی پر پرکھیں، تغزل کے آئینے میں دیکھیں تو بمشکل دو چار ہی معیاری

نکلیں تو نکلیں اور مجموعی طور پر تو کوئی ایک آدھ مجموعہ مجموعِ جامعیت کا حامل ہوگا۔

اب معاملہ یہ بھی نہیں، کسی شاعر نے ذاتی احساس کے تحت غزل کے روپ میں جو شعر کہہ دیا وہ ہر ایک ہی کے لیئے ناٹیر کا تیر بن جائے، جذبات کو مرتعش کر دے، ہر رگِ جاں پر یکساں چوٹ پڑے، ہر دل میں بیٹھے اور ہر زباں پر چڑھ جائے یعنی "خیزد دریزد" کا کلیہ صد فیصد اطلاق کناں نہیں۔ کسی بھی کلیات کا معتد بہ حصہ ریاضتِ فن کا مظہر ہوتا ہے۔ اسی مشقِ سخن کے دوران کوئی ایک آدھ شعر یوں وارد ہو جاتا ہے کہ زباں زد ہو کر ایک ہی تاثر کے ساتھ زمانہ دَر زمانہ کامیاب سفر میں رہتا ہے۔ کہاوت بنتا ہے، ضرب المثل ہو جاتا ہے، روزمرہ میں در آتا ہے۔ سخن ور قادر الکلام ہو تو اس کے متعدد اشعار کو یہ شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ پس اس لحاظ سے بڑے چھوٹے اچھے شاعروں کے درجے متعیّن ہوتے ہیں۔ قول صادق ہے کہ قبولِ عام ہی فن کی اصلی پرکھ کا بے عیب آلہ ہے۔ ورنہ تو جس قدر بس میں ہے پُورا زور لگا لیجیئے —— خوش لحن گلوکاروں سے اپنے شعروں کی نغمہ سرائی کا اہتمام کر لو، خوش آمد در آمد کا ہر کام کر لو، حیلے حوالوں سے سرکاری غیر سرکاری ابلاغی ذریعوں کو رام کر لو، وہ جو شریعت نمائش باہمی رائج ہے اس کے ذریعے نکھد کا اونچا مقام کر لو، "لابی" یا حلقہ سازی حلقہ نوازی کا جو چلن عام ہے اس کا بھر پور التزام کر لو۔ ادبی گروہ بندی، فن کارانہ غرض مندی، عیاری پُرکاری کی اچھی گندی فراست سیاست بروئے کار لاکر چھتنا نام کر لو، لیس لا سے سے شہرت کی چہچہاتی چڑیا کو زیرِ دام کر لو —— مگر میرے تازہ گو، جدّتی آدرش کے رسیا ہم صفر و ہم نوا مآلِ کار ثابت یہی ہوگا کہ —— چند دن کی چاندنی ہے!

باہمہ ساز باز مختلف النوع نوازش و اعزاز بہ وسیلہ مشاعری، عمدہ شعریت کی سند نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا یہ تلطف اور مدارا ہمیشہ مدح سرائی کا ثمرہ ہوتا ہے، گو یہ بھی ہوتا ہے، بلکہ اکثر یہ ہی ہوتا ہے۔ بارِ سستی قسم کی مقبولیّت کے طفیل بھی یہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر کورا ان پڑھ نہیں تو قریب قریب یکسر غیر تعلیم یافتہ ہے۔

چند فیصد پڑھے لکھے سُوجھ بُوجھ کے لوگ بھی ثقہ اور صالح ذوق شوق کے معاملے میں کورے ہیں، اصطلاح میں "کورز"! انہیں ادب و ادبیات کا مطلق شعور نہیں، جو بینائی میں جگمگائیں اور دھنک رنگ بھر دے۔ ان کے تئیں یہ وہ نُور نہیں۔ بنام ادب جو سامنے آتا ہے نفسیاتی تناؤ اور جذباتی دباؤ کے تحت ایک طبقہ اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ بے ساختگی کا عمل نہیں، شکستگی کا شاخسانہ ہے، ہنگامی ادب بالعموم ایسا جادو جگاتا ہے۔ ایک دوسرا طبقہ ہے، دکھاوے کے طور پر فنونِ لطیفہ کے قدر دانوں میں شمار آنے کا خواہشمند، بیدانشی میں کہیئے انہیں یہ حیلہ دانشمندانہ ہے۔ مقبولیت کے اس مشکوک ماحول میں اچھے اور بُرے کی صحیح تمیز جاتی رہی ہے —— تاہم عمدہ خوش گوار یادیں دوشیزۂ ادبیات کا زیور بدستور ہیں۔ انقلابی شاعری جوشؔ نے بھی کی۔ محنت کے قصیدے احسانؔ دانش نے بھی لکھے، ملّی تقاضوں کا بیان علامہؔ اقبال نے بھی اپنی مخصوص لغت میں فرمایا۔ قلبی واردات میرؔ نے اور سماجی واقعات نظیرؔ نے بھی موزوں کیئے اور زوال پذیر معاشرے کا نوحہ غالبؔ نے تو غزل ہی کے میڈیم میں کہا۔ لیکن جس طرح ان دنوں اس متعین فن کو صحافیانہ، مظاہرانہ، سوقیانہ یا سرسری و سطحی سلوک کے ساتھ برتا جارہا ہے وہ محض شعر گوئی ہے، شاہدِ غزل کی اشک شوئی ہے، یا پھر غزل نگار کے مدّنظر ذاتی دلجوئی ہے۔ شعریت سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں۔

لہٰذا —— غلط سلط قدروں کے اس قلم کوب، ادبی طور پر پُرآشوب زمانے میں آپ سکہ بند آبگینۂ غزل لے کر نکلیں تو جان لیں کہ اسے ٹھیس لگے ہی لگے۔ پہلے پہلے تو "یارانِ نکتہ داں" اس پر جدّت کا پتھر ماریں گے، اس حسینہ کا سنگھار کھرچ کھرچ کے اُتاریں گے۔ رجعت کا لیبل لگا دیں گے۔ روایت پرستی کا مورد ٹھہرا دیں گے، ہیئت زبان میں وہ ہیئت کذائی پائیں گے، خیال کی دیرینہ روش کی بھد اڑائیں گے۔ القصہ اپنے ردیلے نظریے، ٹھکانے پیمانے کے مطابق نہ پاکر ناقابلِ قبول قرار دیں گے، ہر طعنہ ناگوار دیں گے۔ تنقید کی باریک چھلنیوں میں چھانیں گے۔ حسن کے معاملات کو فرسودہ گردانیں

گے۔ دل کے معمولات کو مضحکہ خیز جانیں گے۔ کسی مخصوص "آدرش" کی بازگشت نہیں سو ٹھیٹھ پکاریں گے، ٹھوٹھ مانیں گے۔ سو جانیں اور مانیں ـــ ضرور جانیں، ضرور مانیں۔ ان تمام باتوں کا حق انہیں یوں نہیں ملا کہ بالغ نظری کے اجارہ دار ہیں، بلکہ اس سبب اس کے مدعی ہیں کہ یہ کتاب منظرِ عام پر آگئی ہے۔ کہوان کے ہدف پہ رکھی گئی، ان کی زد میں پہنچ گئی، اب ان سے کوئی یہ دلیل لائے تو کیونکر لائے کہ اے نکتہ ور، یہ اشعار آپ کے نظریات و خیالات، دھیان گیان کے سیاق سباق میں وارد نہیں ہوئے۔ کہنے والے کے فکر کا پس منظر انسانیت ہے، کوئی محدود آہنگ نہیں۔ اس کے قلم کا سبز سُرخ سفید کالا پیلا رنگ نہیں۔ روشنائی صرف روشنی لکھتی ہے۔ بنیادی انسانی جذبے۔ پیار محبت، دُکھ درد، آس یاس وغیرہ ـــ مشترک ہیں۔ ان کی بنیاد پہ جو اظہارِ خیال ہوگا وہ ہوگا، کیا نہیں جائے گا ـــ پس مصلحت و مصالحت سے بے نیازانہ ہے منت پذیر اعتنا، مستغنی احسوس سعی و کاوش کا اس میں دخل نہیں۔ دیکھو بہتی رو کو پابستہ کون کرسکتا ہے، سوچو ہوا کی رو پہ روشِ پابند کی تہمت کون دھر سکتا ـــ میرا ہی شعر ہے۔

نہ روک اے مرے نقاد شعر کہنے دے
ہوا کی رو پہ نہ زنجیر ڈال ـــ بہنے دے

۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء

شوکت واسطی
(اسلام آباد)

آوازِ دوست

(ایوب محسن)

شوکت واسطی کے اس مجموعہ غزلیات پر اظہارِ خیال کی دعوت میرے لیے بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ میرے لیے یہ باعثِ مسرت بھی ہے کیونکہ اس کے ساتھ میرے دوستانہ تعلق کا عرصہ تقریباً ساٹھ سال پر محیط ہے۔ یقیناً مجھے اس کے شخصی رجحانات کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کا بھرپور موقع اس وقت سے مہیّا ہُوا جب وہ ابھی صلاح الدّین تھا اور ہم اسلامیہ ہائی اسکول راولپنڈی میں ثانوی جماعتوں میں ہم سبق تھے۔ ہماری باہمی شعری وابستگی کا زمانہ بھی پچاس سال سے اوپر ہو چکا ہے۔ پس میں نے اس کی ذہنی پختگی اور شعری صلاحیّت کے ارتقاء کو بچشمِ خود دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

اس پسِ منظر میں عام طور سے یہ گمان ممکن ہے کہ میں اس کے کلام کے بارے میں لکھتے وقت اس دوستی اور تعلق کو ملحوظ رکھوں —— اور یہیں اس ذمہ داری کی بات آن پڑتی ہے جس کا میں نے اوپر اشارہ کیا۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ کسی نگارش اور تحریر کا ادبی مقام متعیّن کرتے وقت مثبت یا منفی تعصّب کا دخل نہیں ہونا چاہیئے اور تبصرہ نگار کو پُوری دیانت داری سے کام لینا چاہیئے۔ مزید میرا نظریہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے بعض معاملات میں اگر کوئی منافقت کا رویہ اختیار کرنے پر مجبُور بھی ہو جائے، شعروشاعری پر تنقید کے مسئلے پر غیر جانبداری شرطِ اوّل ہے۔ میں ادبی محاسبے اور جائزے کے بارے میں اپنے ضمیر کے بتائے ہُوئے راستہ پر سختی سے چلنا پسند کرتا ہوں۔

بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کسی شاعر کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے اس کی شخصیّت کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ اس کے ذاتی احساسات اور رجحانات، اس کے مُعاشرتی

سیاسی اور معاشی نظریات یہاں تک کے اس کا سارا ماحول پیش نظر نہ ہو تو اس کے شعری رویوں کو جاننا اور پرکھنا ممکن نہیں۔ شوکت واسطی کو بھی اس کلیہ سے استثنا حاصل نہیں۔ ایک اچھے فن کار کی طرح وہ اپنی شاعری کے موضوعات اپنی زندگی اور ماحول سے اخذ کرتا ہے اور اپنے فکر و خیال کو احساسات کی بھٹّی میں سے گزار کر انہیں پھر واپس زندگی کو لوٹا دیتا ہے۔ وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے فرق کو سمجھتا ہے اور قارئین اور ناقدین کے سامنے اپنا کلام رکھ کر کھُلا چیلنج دیتا ہے۔

اَدب اَدب کیلئے ہے کہ زندگی کیلئے
مری بیاض اُٹھا لو تو فیصلہ ہو جائے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کی شاعری (خصوصاً غزل) ایک مقصد، ایک رجحان اور ایک مخصُوص سوچ کی آئینہ دار ہے جس میں شعر برائے شعر کے فلسفے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مَیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ عدمِ مقصدّیت بھی بالآخر مقصدّیت ہی کا دُوسرا رُخ ہے کیونکہ اس موشگافی کا کوئی انجام نہیں۔ اس طرح ہم بہت سے دیگر اَدبی مسائل میں اُلجھ جائیں گے۔ بہرحال اس قدر تو مسلّمہ ہے کہ ہر قسم کی نکتہ آرائی سے بچ کر یہ کہنا کافی ہو گا کہ ادب کا زندگی سے تعلق ضرور رہنا چاہیئے۔ جس ادب میں زندگی جلوہ گر نہیں وہ ادب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مزید چونکہ زندگی میں حسن و عشق سے زیادہ محرک کوئی جذبہ نہیں اس لیے یہ جذبہ تشکیلِ ادب کا باعث بنتا ہے۔ شوکت کی تمام شاعری جذبۂ محبت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔

بنتی نہ تمہارے گیسو و قامت کی حکایت
ہم لوگ جو ذکرِ رسن و دار نہ کرتے

کھُلتی گئی ہر ایک گرہ نفسیات کی،
جُوں جُوں غزل میں تیرے حوالے سے بات کی

شوکتؔ اپنے تو ہر اک شعر کے پس منظر میں
کوئی خوش ذوق ادب شیفتہ مہ رُو نکلی

شوکتؔ اک گُل بدن ایسا ہے بہار افزائش
عمر بھر جس نے رکھا میرا گُلِ جاں تازہ

عجیب جانئے یا عین تقاضائے فطری (بشری) کہ شوکتؔ کے ہاں بیشتر حسیاتی یا مادی (مجازی) محبت کے رجحانات نمایاں ہیں، روحانی محبت کے اشارے، اگر ہیں بھی تو برائے نام —— اس کی جمال پرست فطرت بدن و قامت، عارض و لب، چشم و زلف بلکہ ان سے آگے پیار اور لمس کی رعنائیوں اور لذتوں کی عکس کش ہے۔

ساغر بہ لب بھی عالم صد کیف ساز تھا
لیکن جو لطف کیفیت لب بہ لب میں ہے

ہم اہلِ روح بدن پہ عقیدہ رکھتے ہیں
پس آرزوئے لب و زلف و دیدہ رکھتے ہیں

ع :- مے کا مُشتاق ہے دل، آنکھ کا سودائی ہے

تھی ہوائے لب و رخسار ہمیں کچھ ایسی
جان کر شعلۂ گل بھر لیے دامن میں چراغ

اگر نشہ ہے تو ساقی کی مست آنکھوں میں
اگر مزہ ہے تو محبوب کے کنار میں ہے

شوکت کا قلم مضامین حسن و عشق کے علاوہ بھی متعدد دوسرے موضوعات پر بڑے شوق سے چلتا ہے۔ اس کا دل پسند مضمون ایسے لوگوں کی فریب کاریوں کو بے نقاب کرنا ہے جو اس کے سامنے بظاہر دوستی کا روپ دھار کر آتے ہیں اور عرصہ تک اس کے قریبی ہم نشین بن کر رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی دھوکا بازی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ شوکت کے لیے دوستی کے پردے میں دشمنی کا یہ ڈرامہ شدید اذیت کا باعث بنا رہتا ہے۔ دوستی کے جذبے کی اس بے حرمتی پر اسے دوستی کی INSTITUTION پر ہی اعتماد نہیں رہا۔ اس "سلسلے" کے دوستوں کے متعلق اس کے کلام میں جا بجا شدید ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔

تم نے چھپ کر محاذ کھولا ہے
تم سے کھل کر مقابلہ ہوگا

ہمدم نہ ڈر کہاں کا زمانہ کہاں کے لوگ
حائل نہ کب دلوں میں ہوئے درمیاں کے لوگ

مدِ مقابل اپنا سا گر ہو تو بات ہے
شوکت ہو گر حریف کم اوقات، کیا کہیں

جس قدر اپنے تھے رفتہ رفتہ بیگانے ہوئے
اجنبی لگتے ہیں چہرے جانے پہچانے ہوئے

بڑے شوق سے دُنیا فریب دیتی رہی
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے رہے

ہم عزیز اس قدر اب جی کا زیاں کہتے ہیں
دوست بھی رکھتے ہیں تو دشمن جاں رکھتے ہیں

سنگ زن ہم پہ وہی طفل ہیں شوکت جو کبھی
ہم سے لیتے تھے سبق چاک گریبانی کا

ہر غیر سے تو خوب گذارا کیا ، مگر
اے دل معاملہ ترا اب آشنا سے ہے

ملنے لگے ہیں صورت یاران صاف دل
جب زیر کر سکے نہ ہمیں دشمنی سے لوگ

جب نفع دوستی کی تجارت میں کم ہوا
تو دشمنی کا کرنے لگے کاربار لوگ

یہ کیفیت ذرا وسعت اختیار کرتی ہے، تو شوکت انسان سے رجوع ہوتا ہے جو عرفِ عام میں "اعضائے یک دیگر اند" ـــــ لیکن ہائے باہم بدسلوکی کی وجہ سے" انسانم آرزو ست" کا المیہ عام ہو گیا ہے۔ یہاں بات کرتے وقت شوکت کا لہجہ زیادہ تلخ ہو جاتا ہے۔

گر آدمی آدمی سے پلٹے امان شوکت
تو پھر کسی بھی مہیب آفت کا ڈر نہیں

اسقدر دیکھے ہیں ہم نے آدمیت کے حریف
شوکت اب ہوتی ہے وحشت آدمی کے نام سے

کیفیت یہ ہے کہ رہتا ہوں مگن حیوانوں میں
آدمی ہو کہیں سامنا تو ڈر جاتا ہوں

پھولوں سے بھرے باغ بھی ویران نظر آئے
شہروں میں بہت کم ہمیں انسان نظر آئے

شوکت اِک اُجڑے ہوئے گلشن میں ہوں نغمہ سرا
شوق نے کن بدذاقوں میں غزلخواں کر دیا

زمیں کے جسم کا سب رس نچوڑ کر انساں — چلا ہے چاند کے چہرے کا نوچنے غازہ

(ضمناً عرض کرتا جاؤں دوسرے مصرعے میں "چ" کی صوتی خوبصورتی کا کوئی جواب نہیں)

○

ادب زندگی کا مظہر ہے تو وطن سے محبت کی جھلکیاں بھی اس میں ملیں گی۔ اہل وطن پر سیاست کے کاروبار نے جو مظالم ڈھائے ہیں شعر کا موضوع ضرور بنیں گے۔ معاشرے میں ایک مخصوص طبقے نے ذاتی مفادات کی خاطر عوام کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھایا ہے، وہ آشکار ہو اور اس صورت حال سے حساس دل شاعر پر جو گزری، اس کی عکاسی کی جائے۔ آزادیٔ وطن سے جو خوشگوار توقعات وابستہ تھیں، وہ جس بُری طرح پاش پاش ہوئیں، جو سہانے خواب دیکھے تھے، جس دکھ بھرے طریقے سے بکھر بکھر گئے — ان کا دلدوز تذکرہ شعر کا قدرتی مضمون بن گیا — شوکت واسطی نے صرف ایک شاعر کی حیثیت سے ہی زندگی کے ان تضادات کو دیکھا ہوتا تو الگ بات تھی۔ لیکن وہ تاریخ کا ایک طالب علم بھی تھا۔ انسانیت پر صدیوں کے دوران جو جو گزرا اس کا شعور رکھتا تھا۔ ایک باخبر دانشور کی حیثیت سے بھی وہ ایک مخصوص سوچ کا حامل تھا اس لیے ملکی حالات کے تدریجی بگاڑ کی وجوہات سے آگاہ تھا۔ جبر و استبداد کی چیرہ دستیوں سے بخوبی واقف تھا۔ سرمایہ داری کے نظام کے اندرونی خلفشار کو سمجھتا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ایک ہوشمند انسان کی قوتِ برداشت کی حدوں سے آگے تھا۔ اور ایک دردِ دل رکھنے والے شاعر کے شدید ردِعمل کا طالب — اس نے لڑکپن سے تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ جانتا تھا اس کا آبائی علاقہ کسی صورت میں بھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس حقیقت کو نظرانداز کر کے اس نے آزادی کی جنگ میں اپنا کردار ادا کیا اور ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء حصولِ وطن کی جدوجہد میں بھرپور شرکت کی۔ ہجرت کے قیامت خیز مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنی ذات پر جھیلے۔ اعزہ اور اقربا کی شہادتوں کا رنج سہا سب کچھ لُٹا کر، آبائی اثاثہ چھوڑ چھاڑ کر اس نے پاکستان کا خیر مقدم کیا لیکن پھر اس کے

خواب بکھر گئے۔

اس تمام صورتحال سے وہ متاثر کیوں نہ ہوتا۔ آبرو، مال متاع، گھر بار کی قربانیاں رائیگاں جاتے دیکھ کر وہ خون کے آنسو کیوں نہ روتا۔ صاحبانِ اقتدار کی ہوسکارانہ خود غرضیاں اسے آزردہ خاطر کیوں نہ کرتیں۔ چنانچہ اس کی غزل کا ایک بڑا حصہ معاشرے کو ملیامیٹ کرنے والوں کے خلاف احتجاج پر مشتمل ہے۔

اس مہرباں نے چاند یا سورج تو کیا دیئے
دو اک دیے تھے شہر میں، وہ بھی بجھا دیئے

روش روش پہ چمن کے بجھے بجھے منظر
یہ کہہ رہے ہیں یہاں سے بہار گذری ہے

شوکت اک خواب جو دیکھا تھا سہانا ہم نے
اس کی ہلکی سی رمق بھی کہاں تعبیر میں ہے

وائے وہ موسمِ گُل جس میں خزاں یاد آئے
ہائے یہ نقشہ بھرے شہر میں ویرانی کا

انقلاب آئے، بدستور مگر باقی ہے
فرق جو بوریا و بستر سنجاب میں تھا

کپڑے تو الگ جس نے بدن نوچ لیے ہیں
لو نام کہ وہ شخص بھی عریاں نظر آئے

○

باغباں بھی ہے تصرف میں شریک گُل چیں
اس حقیقت کو کئی اہل چمن جانتے ہیں

○

بنا ہے دیس ایسی جھیل جس میں
کنول اک آدھ ہے، کائی بہت ہے

○

وہ ڈر آیا کہ ہر کوتوال چور کے ساتھ
چراغ ہاتھ میں اب رات بھر اٹھائے چلے

○

امیرِ وقت دساور میں کوڑیوں کے مول
وطن کو بیچ کے خوش ہے بڑی کمائی کی

قابلِ ذکر اک یہی ہے بات آزادی کے بعد — اور پابندی بڑھی ہے اور نگرانی ہوئی

واعظوں شیخوں خطیبوں کی رہیں ہم راہیاں ○ سربراہوں کج کلاہوں اور شہنشاہوں کے ساتھ

ستم ظریفیٔ تاریخ ہے کہ مستبد گیر ○ سدا خواص ہوئے انقلابِ عام کے بعد

○

زندگی میں جس قدر تنوع ہے رنگا رنگی ہے، رعنائی و حسن ہے، شوکت کے کلام میں اس کی عکاسی ہے۔ انسان کی ذات گوناگوں جذبات، احساسات، حیات کا مجموعہ ہے۔ شاعر نے ان کی ترجمانی اپنے مخصوص رنگ میں کی ہے۔ مشاہدہ کرنے والوں نے مرورِ ایام سے چند مستقل حقائق اخذ کئے ہیں۔ تجربات کی روشنی میں انسان نے کلیے قانون وضع کئے ہیں جو آفاقی سچائیاں کہلاتی ہیں۔ ان سچائیوں کے اجالے میں ہر فنکار ہر ادیب ہر شاعر زندگی میں اپنا راستہ متعین کرتا ہے کوئی دیدہ ور اپنی افتادِ طبع کے سبب نئے نئے رموز تلاش کر لیتا ہے۔ وہ دوسروں ہی کے تجربوں سے مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ اپنی ذات پر بیتی ہوئی حقیقتوں کی روشنی میں اپنی آگہی کے خدوخال واضح کرتا ہے۔ شوکت واسطی بھی انہی چند باغی اذہان کی صف میں کھڑا ہے۔ وہ دوسروں کی دریافت کردہ سچائیوں کو بھی قبول کرتا لیکن اپنی شخصیت سے حاصل کردہ تجربات کی رہنمائی میں وہ اپنی منزل کی طرف گامزن رہنے میں زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ اپنے الگ بناتے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ معاملات حسن و عشق میں بھی محبوب سے انفعالی صورت والی محبت کا قائل نہیں۔

انفعالی وہی صورت ہے محبت کی اگر — قیس ہی لائق تقلید نہ فرہاد ہمیں

نیازمندیٔ عشق کو اس قدر عطا کر — جو حسن کو یہ ادائے بے اعتنائی دی ہے

وحشت کے واسطے نئی تدبیر چاہیئے — ان مہوشوں کے پاؤں میں زنجیر چاہیئے

ہم نے آدابِ ملاقات سکھائے اس کو — تب وہ محبوبہ کہیں درخورِ پہلو نکلی

اب کے وفا کی داد ہماری طرف سے ہو — آپ کے خفا ہوتے ہیں اگر ہم، مناؤ تم

شوکت کا مجنت میں یہ عجب جارحانہ رویہ ہے کسی حد تک بالکل نیا۔ یہ رویہ کہ وہ نہیں ہو سکتا جو محبوب چاہے۔ بلکہ ہو گا وہ جو عاشق چاہے گا ــــ وہ دیگر حالات میں بھی مدافعانہ طرزِ عمل کا قائل نہیں۔ اسے جیسے پرواہی نہ ہو کہ اس کی گرم و تیز باتیں سُن کر کوئی بُرا منائے گا۔

جو زمانے کی سماعت پہ گراں لگتی ہے   ہم تو شوکت ہیں وہی بات سنانے والے!

اس کا یہی جارحانہ لب ولہجہ سرحد کے بارے میں بھی نمایاں ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ پشاور میں گزارا ہے ــــ وہاں آباد بھی ہو گیا، گھر بنا لیا اور عزم بھی یہ تھا کہ تاحیات وہیں رہے گا۔ مگر وہاں اُسے اطمینان نہ ملا، برگشتہ ہو کر ایک بار پھر ہجرت پہ مجبور ہو گیا۔ اہلِ پشاور کا کہنا ہے کہ خوُد اس نے سمجھوتہ نہ کیا۔ جو بھی صورت حال ہو، اس کی زندگی کا یہ مسئلہ وضاحت طلب رہے گا۔ اس بارے میں یہ تند و تیز الفاظ ذہنی اذیت کا پتہ دیتے ہیں۔

جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی شوکت   ہم نے جب شہر پشاور میں قدم رکھا تھا

ھم آ پھنسے جو پشاور میں کیا گلہ یوسف   قفس مقام ہے مُرغانِ نغمہ زن کیلئے

یہ قطعہ:- کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر شوکت   کون سی بات پہ اس شہر میں ہم یوں خوش تھے

صرف احسان فراموش نہیں لوگ یہاں   بلکہ اک خاص روا بیت وہ محسن کش تھے

یا پھر بد ڈنک کھا کے سارے تن پہ ہیں بہت حیران ہم   ڈھونڈتے تھے بچھوؤں کے شہر میں انسان ہم

یہ علاقہ ہے وہ، جہاں شوکت   آدمی ناشناس رہتے ہیں

ذہنی انتشار کا شاخسانہ اس تضاد کو پھر بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا، جب اہل پشاور کے رویے کو فراموش کر کے وہ شہر پشاور کے متعلق اپنے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔

ع   شوکت ترے بغیر پشاور اداس ہے

ع   چلو واپس چلو تم کو پشاور یاد کرتا ہے

یا ــ بھئی شہرت تمہارا شکریہ لاہور بھی دیکھا   خدا رکھے پشاور کو پشاور پھر پشاور ہے

اس نے خود اس گتھی کو اپنے اس شعر میں سلجھا دیا ہے۔

قائم ہے پشاور سے محبت وہی شوکت
دُکھ گرچہ بہت اہل پشاور نے دیئے ہیں

—— شوکت کا یہ مصرعہ خدا رکھے پشاور کو پشاور پھر پشاور ہے ضرب المثل ہی بن گیا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شاعر جس کے شعر یا مصرعے زبان زد ہو جائیں۔ بعض اوقات صرف ایک شعر کسی شاعر کو زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ حفیظ جونپوری کی مثال ہی کافی ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

شوکت واسطی کا کم از کم ایک شعر تو بالکل اسی نوعیت کا ہے۔

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی رہی بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے رہے

بلکہ اس کا قضیہ تو یہ ہے کہ اس کے استاد عبدالحمید عدمؔ کے علاوہ یہ شعر اس دور کے ہر مشہور شاعر کے کھاتے میں ڈالا جا چکا ہے۔ شوکت کے کم از کم دو اور شعر اسی ذیل میں آتے ہیں

ہر بات زندگی میں بڑی دیر سے ہوئی منزل پہ آ لیے تو ہمیں ہم سفر ملے

ہم زندگی کی جنگ میں ہارے ضرور ہیں لیکن کسی محاذ سے پسپا نہیں ہوئے

○

راولپنڈی ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۲ء

اِمتنان

غالبؔ خاص عظیم شاعر لیکن جب دیوان نشر کرنے کی نوبت آئی تو مرزا نے اپنے کانٹے کے سخن فہم دوستوں کی رائے کو صائب مانا اور بہت سے ایسے شعر خارج کر دیئے کہ بعد از یافت اب پڑھیں تو حیرت آئے ان ایسے بدیع گو سخن سنج نے خود اپنی طبیعت ہی کو کیوں عیارِ آخر برقرار نہ رکھا ——— ہم ایسے عام طبع آزمائی کرنے والوں کی توان کے سامنے حیثیت ہی کیا کہ خود کو تلمیذ الرحمان جانیں اپنے جوہرِ شعر گوئی کو عطیہ فیضِ ازلی مانیں ——— اپنی جودت وجدت پر کلی اعتماد کریں اور صرف اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق صاحبانِ فکر و فن کو ہدیۂ طبع زاد کریں۔

پس مرزا کی مثال کو سامنے رکھا ——— میرے استاد عبدالحمید عدمؔ نے جن اشعار کو یکسر قلم زد کر دیا، ان کا معاملہ تو صاف ہو گیا۔ تاہم ساری عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گزری، ہزاروں نہیں تو سینکڑوں کی تعداد میں غزلیں ہوئیں اور کہیں۔ اب اشاعت کا قطعی مرحلہ آیا تو یہ سارا رطب و یابس سامنے تھا۔ میں نے اپنا "یہ سرمایہ" چھان پھٹک کے لیے اپنے تین جیون ساتھیوں کے حوالے کر دیا، کم و بیش کی حسابداری کر دیں۔ دو تو بہت پائے کے شاعر ہیں۔ صادق نسیم محسن احسان اور ایک مسلّم ماہرِ فن۔ ایوب محسن!

انہوں نے جس قدر ردّ کر دیا میں نے "خُلدِ خیال" میں شامل نہیں کیا، ہر چند بعض جگہ واقعی دل پہ پتھر رکھنا پڑا ——— شاعر کی کیفیت بھی عجیب ہے، ایک ماں کی طرح اپنی تخلیق میں اسے بھونڈے پن کی نہیں۔ مثال دوں: میں نے ایک غزل میں مقطع دیا: ردیف قافیہ قلم پہ اترے، ہم پہ اترے۔

اپنی صدری پہ تمہیں عار ہے شوکتؔ جو تم ——— اب مصر ہونے لگے غیر کا جمپر اترے

ایوب محسن کو نہ بھایا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا جمپر بمعنی سویٹر مستعمل ہو گیا ہے صدری یا روئی کی بنڈی کے مقابل آیا ہے۔ وہ بولے یہ عورتوں کا پہناوا مشہور ہے (یعنی ذم کا پہلو نکلتا ہے) شکر ہے میں نے "یار" نہیں کہہ دیا ورنہ مزید زجر و توبیخ ہوتی۔ گیارہ شعر کی غزل، ہر قافیہ اس میں "اترے" کی رعایت سے برتا جا چکا ہے، دانشور دوست کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، آخری شعر بہ دقت اور نکالا!

محسن احسان، صادق نسیم سے بھی کوئی ردوکد نہ کی۔ سو یہ کلام کمال و تمام ان صائب الطبع صاحبانِ فکر و فن کی نظر سے گزر چکا ہے۔ تاہم اگر کوئی سہو یا خامی نظر آئے تو اسے میرے کھاتے میں ڈالیں۔ ان سے تعرض کی نہیں۔

میں ان تینوں دوستوں کا ممنون ہوں، انہوں نے بڑے جوکھم کا کام کیا۔ دو دوستوں کے درمیان کوئی دوست ثالث بنے، ایک ہاتھ سے جائے۔ اور دوست دوست کی رائے کیخلاف مشورہ دے، یہ تو دوستی میں اس سے بھی آگے کی کڑی آزمائش ہے۔ انہیں یہ ہمت ہوئی اور مجھے تسلیم کی برداشت ——

اللہ کریم کرے سب دوستوں میں افہام و تفہیم کا یہ سلیقہ عام ہو۔

شوکت واسطی

اسلام آباد (۱۹۹۳)

جلّ جلالہ

تری ہی رُوحِ ازل کا پاکیزہ سلسلہ جسم تک رہا ہے
تجھی سے ہر سانس آ رہا ہے تجھی سے ہر دل دھڑک رہا ہے

تری توجّہ سے مومنوں کو ہُنر کی توفیق مل رہی ہے
کہ بیج میں رزق اُتر رہا ہے ہرا بھرا کھیت پک رہا ہے

تری تجلّی کے نور میں کائنات کو دیکھتی ہیں آنکھیں
ہر ایک چہرے کا عکس تیرے ہی آئینے سے جھلک رہا ہے

کہیں جو طائر چہک رہا ہے تری ہی کچھ بات ہو رہی ہے
تری ہی مہکار آ رہی ہے کہیں جو غنچہ چٹک رہا ہے

اُٹھا تھا تیرے حضور دستِ دُعا کا بالکل تہی پیالہ
بھری ہے یوں اوک چشمۂ فیضِ جاوداں سے چھلک رہا ہے

عجب نہیں ہے جو کر دے لبریز قطرہ قطرہ مرا سبُوچہ
کہ تیری رحمت کا ابرِ نیساں صدف صدف میں ٹپک رہا ہے

عطا کر (اس کو بڑی ضرورت ہے) بادۂ معرفت کا ساغر
کہ آدمی اب شرابِ پندار کے اثر سے بہک رہا ہے

دکھا اِسے مستقیم رستہ، اِسے ہدایت نصیب فرما!
شعور کے باوجود اِس دور میں یہ ناداں بھٹک رہا ہے

ازل سے لاریب فیہ قائم ہے تو، ابد تک رہے گا قائم
خود اُس کا اپنا وجود مشکوک ہے جسے اس میں شک رہا ہے

○

بیت

حصولِ مقصد گراں نہیں ہے خلوصِ نیت اگر ہے شامل
دُعا نہیں باریاب تیری کہ تو شریکِ دُعا نہیں ہے

○

عزّ و شرف کی بات ہے جو ہو قبولِ عام
کلیات حُسنِ عرض سے خالی نہیں ہے یہ
یہ برگِ سبز تحفۂ درویش جانیے
پیش از تعلّیِ مُتعالی نہیں ہے یہ
تصویرِ خانماں ہے، تصوّر سرا نہیں
خُلدِ خیال ـــــ خُلدِ خیالی نہیں ہے یہ

○

یارب ہے دل مدام کسی اضطرار میں
کچھ نقص رہ گیا ہے ترے شاہکار میں

قائم ہے آرزو کا بدستور انبساط
آپ آ چکے، ہے قلب ہنوز انتظار میں

تنہائیِ سفر کی اذیّت ہے دلشکن
اب کوئی راہ زن ہی ملے رہگذار میں

عہدِ خزاں ہے موسمِ ہجرت طیور کا
یہ میرے ہمصفیر ہیں فصلِ بہار میں

تیرے ستم پہ تیری طرف دیکھ کر ہوں چپ
یہ احتجاج تو ہے مرے اختیار میں

تاہم کبھی کسی سے کدورت نہ چاہیئے
ہرچند احتیاط ہو ملحوظ پیار میں

شوکت، حیات ایسے پشاور میں کی بسر
گویا رہا ہوں معرکۂ کارزار میں

○

کیوں پھول بن کے نازِ بہاراں اُٹھائیے
مَر جائیے کِسی کا نہ اِحساں اُٹھائیے

دوزخ بنائیے کِسی ذرّے کو توڑ کر
قطرہ نچوڑ کر کوئی طوفاں اُٹھائیے

ساقی لبوں کا لمس مِلا دے شراب میں
اِک دن تو لُطفِ ذائقۂ جاں اُٹھائیے

کہتی نہ دیں رہا کہ افاقہ جنُوں کو ہے
ہنگامہ پھر کوئی پسِ زنداں اُٹھائیے

ہم آئینہ ہیں آپ ہیں توقیرِ آئینہ
ہنس کر نقابِ روئے درخشاں اُٹھائیے

قائل رہے نہ پھر کسی صحبت کا آدمی
محفل سے اس طرح نہ پشیماں اُٹھائیے

شوکتؔ غزل تو یہ ہے کہ اپنے شعور سے
اس مہ جبیں کا لحنِ غزلخواں اُٹھائیے

○

○

جہاں جہاں نو دمیدہ صبحِ تمہاری روشن کرن گئی ہے
سمٹ سمٹ کر جبینِ انساں سے تیرگی کی شکن گئی ہے

ذرا ان آزادہ رو بہاروں کے تند پندار کو جگانا
خزاں بڑی احتیاط سے ہمصفیرِ سوئے چمن گئی ہے

غلط کرو غم نہ بے محابا، کہیں حوادث نہ دیکھ پائیں
نظر بچا کر اُٹھاؤ ساغر کہ زندگی جُرم بن گئی ہے

ہُوئی اگر مشتہر محبت نہ طنز فرما مرے جنُوں پر
تری جوانی کی داستاں بھی تو انجمن انجمن گئی ہے

سماج اَب سیم و زر کی دیوار اور اُونچی نہ کر سکے گا
نیا زمانہ، نیا زمانہ، گئی وہ رسمِ کہن گئی ہے

بقائے ترتیب عنصری کے ہزار ایجاد کر کے نسخے
حیات ہر شکل میں جہاں سے وہی شکستہ بدن گئی ہے

ادب میں شوکت نئے نئے نظریوں کی تخلیق ہو رہی ہے
حیات کی سرحدوں تک آخر نگاہِ اربابِ فن گئی ہے

○

صلوا علیہ وآلہٖ

یہ ہم لوگ، وہ چاند تارے ترے
یہ نظریں تری، وہ نظارے ترے

بیاباں ہیں باں ترا آسرا
سمندر سمندر سہارے ترے

کُل انسانیت کو ہے تجھ سے شرف
سب اخلاقِ انساں سنوارے ترے

ہمیں حق نُما ہے تری ذاتِ پاک
ہیں ارکانِ دیں استعارے ترے

تری مہربانی زماں در زماں
کوئی کیسے احساں اُتارے ترے

نہیں ڈر ہمیں کوئی منجدھار سے
دکھائے ہوئے ہیں کنارے ترے

یہ عاصی یہ دیندار یہ پارسا
شفاعت کے محتاج سارے ترے

ابُوبکرؓ، عثمانؓ، عمرؓ اوؔر علیؓ
ہمیں دل سے پیارے یہ پیارے ترے

پھرا ہے یہ شوکت بہت دَر بدَر
بس اب زندگی گھر گذارے ترے

○

ابیات

جب بھی ہم منقبتِ شاہِ عربؐ کرتے ہیں
شرحِ آیاتِ مُبیں لہجہ و لب کرتے ہیں

○

شوکتؔ درِ حضورِ رسالتؐ پہ حاضری
مقدُور کی نہیں ہے، مقدّر کی بات ہے

○

تمہید

○

نازل سما سے نسخۂ عالی نہیں ہے یہ
کُلیاتِ حسنِ ارض سے خالی نہیں ہے یہ

کرّوبیاں کے لہجے میں موزوں نہیں ہوئی
حُور و پری کے نطق میں ڈھالی نہیں ہے یہ
ہر ایک چیز اُٹھائی ہے دامانِ زیست سے
سچ ہے زِجیبِ غیب نکالی نہیں ہے یہ
ماحولِ روزمرہ پہ پھینکی کمندِ فکر
مافوق و ماورا کہیں ڈالی نہیں ہے یہ
دستک جو دی تو دی ہے درِ گردوپیش پر
دہلیزِ کہکشاں پہ سوالی نہیں ہے یہ
جذبات کی لُغت سے ہے ماخوذ لفظ لفظ
منطق سے مُستعار نوالی نہیں ہے یہ
ہے جائزہ آدمی کی یہ ہر آن نقش گر
عکاسِ شاہزادہ و والی نہیں ہے یہ

کھیلی ہے عام لڑکیوں میں شاعری مری
شہزادیوں کی گود کی پالی نہیں ہے یہ
ہوتی ہیں آبیاریاں امرت سے پیار کے
بنجر رکھے دلوں کو وہ مالی نہیں ہے یہ
جو پیرِ بادہ خانہ سے بدظن کبھی کرے
ہاں شیخِ صومعہ سے دُعا لی نہیں ہے یہ
تاثیر کے لحاظ سے تریاک اسے کرے
مَے جس میں سم بنے وہ پیالی نہیں ہے یہ
وجداں کی روشنی بھی سموئی ہے ساتھ ساتھ
عرفاں کے نُور ہی سے اُجالی نہیں ہے یہ

جو منحرف ہیں ان کیلئے بھی دعائے خیر
گر یوں غزل لگے بھی تو۔ گالی نہیں ہے یہ
صدیوں سے اپنی وضع کی ہے آپ یہ مثال
کیوں مُدعی کہے کہ مثالی نہیں ہے یہ
جدّت کے ساتھ بھی اسے ہم جانتے ہیں خام
گر رہنِ طرزِ غالبؔ و حالیؔ نہیں ہے یہ

ذرا توجہ تو دے محبت کی سادگی کس قدر حسیں ہے
کہ تجھ سے میں اس وثوق سے زہر لے رہا ہوں کہ انگبیں ہے

مجھے خبر ہے کہ زندگی کے وقار کا مسئلہ بھی ہے یہ
میں کیا کروں سامنے ترا نقشِ پا ہے اور پھر جبیں جبیں ہے

گھنیری زلفوں کا سایہ پھیلا دے رُوح کو نیند آ رہی ہے
بڑا پُر آشوب ہے زمانہ، سکوں کا عالم کہیں نہیں ہے

چراغ ہمّت مجھے ہے منزل نما، صدائے قدم جرس ہے
نہیں، کسی راہ میں تری احتیاج اے راہبر نہیں ہے

شرف ہے انسانیت سے اول، شرف ہے انسانیت سے آخر
حق آفریں صرف یہ عقیدہ ہے، ماسوا کفر ہے نہ دیں ہے

عظیم ہے ایشیا، بنی آدم ایشیا کا حلف اٹھائے
جہاں ضمیرِ آدمی پہ نازل ہوا یہی پاک سرزمیں ہے

کوئی محبت ہے اس لحد میں بھی دفن جس پہ اُگا ہے سبزہ
ہے شوکت اک یادگار یہ بھی جو روضۂ تاج مرمریں ہے

○

کیا کیا ہے جی میں یوں بھی ملے وہ اگر ملے
دل سے ملے دل اور نظر سے نظر ملے

ہم نے کیئے ہیں جمع محبت کے وہ خیال
تیری حسین آنکھ میں جو منتشر ملے

ہر بات زندگی میں بڑی دیر سے ہُوئی
منزل پہ آ لیے تو ہمیں ہمسفر ملے

ہو جائے گر طلوع کسی دل میں کچھ اُمید
تم اس خلوص سے مجھے کیا سوچ کر ملے

اہلِ خرد سے بھی ہے روایت حدیثِ عشق
اہلِ جنوں سے اور یہ کچھ معتبر ملے

اے ہمصفیر بس ہے یہی داستان درد،
قیدِ قفس میں آ کے ہمیں بال و پر ملے

ہر ایک سے ہم اپنا پتہ پوچھتے پھریں
لیکن ہمیں کسی سے نہ اپنی خبر ملے

گمراہ ہو گئے کہیں منزل کے آس پاس
نام خدا کچھ ایسے ہمیں راہبر ملے

سوچا تھا ان کے دم سے گذاریں گے زندگی
شوکت ہمیں وہ ہم سے بھی مجبور تر ملے

ابیات

ابتدائے شعور ذوق سخن
انتہائے شعور خاموشی

شوکت ہر آدمی نے وہ تکلیف دل کو دی
ہم آئینے میں اپنے سراپا سے ڈر گئے

اس لیے میں جرمِ مے نوشی پہ آمادہ نہ تھا
لمسِ ساقی کے لبوں کا شاملِ بادہ نہ تھا

جس پہ گُل بوٹے نہ تھے اس پر منقش تھے خدنگ
زیست کی ارژنگ کا کوئی ورق سادہ نہ تھا

اب تمنّا گاہ کیوں ویران ہے اس کے بغیر
میں کبھی سنجیدگی سے جس کا دلدادہ نہ تھا

میرے دل میں بھی تھے ابرو اور آنچل جابجا
کس عبادت گاہ میں محراب و سجادہ نہ تھا

شہرزادِ زندگی اک الف لیلیٰ لائی تھی
گوش بر آواز لیکن کوئی شہزادہ نہ تھا

کون سے جادہ پہ کچھ چل کر کوئی منزل نہ تھی
کون سی منزل سے آگے پھر رواں جادہ نہ تھا،

ریت کی دیوار تھا شوکت حصارِ جسم بھی
کب نہ بے بنیاد تھا یہ، کب یہ افتادہ نہ تھا

جسم کو جاں کا سرا پردۂ رعنائی کر
سائے کو دھوپ میں پھیلا کے نہ ہرجائی کر

فکر کو ذہن کی دیوار پہ تصویر بنا
آنکھ کو مدح سرا، دل کو تماشائی کر

ہیں تری ذات میں بھی بوقلموں ہنگامے
تو اسے صرف تماشہ گہِ تنہائی کر

شہر در شہر ترا نام نکلتا جائے
اے ستم گر مری جی کھول کے رسوائی کر

عین ممکن ہے کہ ہو جائے یہی سجدہ قبول
اپنی دہلیز پہ اب ناصیہ فرسائی کر

مرنے والوں کو جِلانے کا تکلّف کیا ہے
جیتے جی مر گئے جو ان کی مسیحائی کر

شوکت اب آنسوؤں میں بھیگ رہی ہے آواز
درد بہنے لگا ہے ــــ زمزمہ آرائی کر

○

مجھے تو رنج قبا ہائے تار تار کا ہے
خزاں سے بڑھ کے گلوں پر ستم بہار کا ہے

جب آئے ہوش نہ تھا کس نگر سے آئے ہیں
چلے تو علم نہیں قصد کس دیار کا ہے

بیاں یہی سر منبر کریں گے پھر نکتہ
ہمارے واسطے جس پر یہ حکم دار کا ہے

ہر ایک ذرے کو ہے آفتاب کی توفیق
ہر ایک بوند میں امکان آبشار کا ہے

اگر نشہ ہے تو ساقی کی مست آنکھوں میں
اگر مزہ ہے تو محبوب کے کنار کا ہے

ہمارے عشق کی سنجیدگی پہ طنز نہ کر
ہمیں خبر ہے مگر مسئلہ وقار کا ہے

نشاط وصل کے لمحات خوب تھے شوکت
فراق میں بھی مزہ خاص انتظار کا ہے

○

جو کیفیت پسِ وصلِ نگار گذری ہے
بدن کا توڑ کے یکسر حصار، گذری ہے

روش روش پہ چمن کے بجھے بجھے منظر
یہ کہہ رہے ہیں یہاں سے بہار گذری ہے

سنی ہے آپ نے کل تک یہی بصد اصرار
جو بات آج طبیعت پہ بار گذری ہے

نگاہ اَب تو پلٹ آئے، اب تو دل ٹھہرے
سحر ہُوئی ہے، شبِ انتظار گذری ہے

وہ ایک رات نہ کر عمرِ رائیگاں میں شمار
جو ایک رات سرِ کوئے یار گذری ہے

کچھ آشناؤں کے نام آئیں گے، کہوں کیسے
جو واردات سرِ رھگذار گذری ہے

جدید دَور میں شوکت ہو تم غزل آرا
ھمیں یہ بات بڑی ناگوار گذری ہے

○

عقل مصروف نئے دہر کی تعمیر میں ہے
آدمی کارگہِ خنجر و شمشیر میں ہے

کتنے اشکوں سے ہے سیراب پری چہرۂ گُل
کتنے تاروں کا لہو صبح کی تنویر میں ہے

وہ اشارہ جو خموشی سے جنم لیتا ہے
سوزِ نغمہ میں نہ ہنگامۂ تقریر میں ہے

دل کئی ڈوبے ہیں تو عشق نے پائی ہے نمو
رنگ سو اُبھرے ہیں تو حسن یہ تصویر میں ہے

اے خُدا جس پہ کیا تھا ہمیں فردوس بدر
آدمیت کی دلیل ایک اسی تقصیر میں ہے

عدل گاہوں کے حوالے سے بسا ناحق بھی
دار پہ ہے کوئی گردن، کوئی زنجیر میں ہے

ہم نے دیکھا تھا جو اک خواب سہانا شوکتؔ
اس کی ہلکی سی رمق بھی کہاں تعبیر میں ہے

خبر نہیں کون تھی اگرچہ ضرور ہم ذوق کوئی تھی وہ
کہ وجہ دلجوئی ہی نہیں بلکہ باعث شعر گوئی تھی وہ

ہر اک نے رہ گھر کی لی، بسیرا کیا پرندوں نے گھونسلوں میں
بکھیر کے رُخ پہ اپنی زلفِ سیہ گھڑی بھر کو سوئی تھی وہ

اُسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ خُود کو پا گئی ہو
سمجھ مگر یہ نہ آ رہی تھی کہ جن خیالوں میں کھوئی تھی وہ

عجیب تھی وہ، کبھی سماتے سمائی جائے نہ آپ میں بھی
کبھی مجھ اک غیر شخص کی ذات میں مجسم سموئی تھی وہ

ملول چہرے پہ ناگواری کی فصل سی لہلہا رہی ہے
کہاں گئی دل میں اس قدر صدق سے محبت جو بوئی تھی وہ

معاً جو تالیفِ دل کبھی کی تو کچھ تسلّی سی ہو گئی تھی
اگرچہ اچھی طرح سمجھتے تھے ہم کہ صرف اشک شوئی تھی وہ

تمام کے سامنے تو ہنس کر کیا تھا اس نے وداع شوکت
لکھا ہے خط میں مگر اکیلے پہنچ کے گھر خوب روئی تھی وہ

○

ہمدم نہ ڈر کہاں کا زمانہ کہاں کے لوگ
حائل نہ کب دلوں میں ہوئے درمیاں کے لوگ

ہے تیری آنکھ سے بھی زیادہ کہیں نشہ
پھر کیوں نیاز مند ہیں پیرِ مغاں کے لوگ

رخسار و لب کا عالم گُل آفریں نہ پُوچھ
قائل نہیں رہے سحرِ گُلستاں کے لوگ

کچھ یُوں اُجڑ گئیں ہیں نگاہوں کی بستیاں
جیسے ترے ہی ساتھ تھے سارے جہاں کے لوگ

ویران ہو گئی حرم و دیر کی فضا
آ بیٹھے تیری بزم میں ہر آستاں کے لوگ

آخر خلوص کی بھی کوئی حد ضرور ہے
منزل پہ کب رہے ہیں بہم کارواں کے لوگ

بیٹھا ہوں اک طرف کسی فن کار کی طرح
کردار بن گئے ہیں مری داستاں کے لوگ

یہ میرے ہم خیال تھے، یہ میرے ہم زباں
اَب ہیں جو ہم نوا کسی شیریں بیاں کے لوگ

شہرِ وفا تھا دل اسے کیا حادثہ ہوا
شوکتؔ کہاں چلے گئے آخر یہاں کے لوگ

ابیات

آئینے روپ میں ڈھل جاتے ہیں
ہم کہاں جب کوئی تم سا آیا

شاید پھر ان کو جرأتِ لغزش نہ ہو سکے
ضبطِ گناہ کر کے پشیماں ہیں آج ہم

خیالوں میں بڑی شدت سے تو در آئی ہے جیسے
مرا سارا بدن ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے جیسے

سوادِ ذہن میں تیرے بدن کا نور ہے گویا
حریمِ دل میں تیری رُوح کی رعنائی ہے جیسے

اکیلا تھا تو تم سے بزم آرائی سی رہتی تھی
ملے کیا تم کہ طاری عالمِ تنہائی ہے جیسے

بیابانِ تمنا میں مجھے تم نے پکارا ہو
مری آواز یوں اکثر پلٹ کر آئی ہے جیسے

مسلّط ذہن پر رہتے ہیں یوں خود ساز اندیشے
سمندر سے گھٹا اُٹھ کر اسی پر چھائی ہے جیسے

ذرا سی روشنی سے اور بھی واضح ہے تاریکی
خرد نے وہم کی زنجیر خود پہنائی ہے جیسے

بدن ہے شاہکار اس میں مگر دل کی قلمکاری
کسی فن کار نے یہ دل لگی فرمائی ہے جیسے

لگا دے گی کنارے پر خموشی سے بھی اک دن
ہمیں چُپ چاپ موجِ جاں بہا کر لائی ہے جیسے

متاعِ شوق چشمِ یار کی خیرات ہے شوکتؔ
ہر اک نظارہ دَر یوزہ گرِ بینائی ہے جیسے

ق

خُدا رکھّے بڑی تعداد میں ہیں
ہمارے مونس و ہمدم وغیرہ
مگر اے اجنبی دُکھ تو نے بانٹا
جزاک اللہ فی الدارین خیرہ

مت زیرِ زلف رُک، کسی دل میں ٹھہر نہیں
سایہ ہو یا سرائے، مسافر کا گھر نہیں

اب کے کسی کی زلف محیطِ حواس ہے
اب کے وہ رات چھائی ہے جس کی سحر نہیں

میرا شباب بھی تو پرستش کی چیز ہے
کیوں نازنین تجھ میں شعورِ نظر نہیں

بے اختیار تم نے وہی بات مان لی
جس پر ہمیشہ کی تھی بہت سوچ کر نہیں

عالم سہی، نہیں ہے خود آگاہ جو فقیہہ
وہ اہلِ آگہی کے لیے معتبر نہیں

یہ سلسلہ ہے مجھ سے تری ذات تک دراز
اس دردِ زندگی کی حدیں مختصر نہیں،

سائے سے آدمی کے جو شوکت اماں رہے
دنیا میں ہیں بھی اور بلائیں، تو ڈر نہیں

○

کچھ ہُنر اور سمجھتے ہیں نہ فن جانتے ہیں
ہم ترے ذکر کو شایانِ سخن جانتے ہیں

رُوح کی غایتِ علوی کا نہ ہو اندازہ
ہم مگر مقصدِ تخلیقِ بدن جانتے ہیں

استعارے ہیں ترے عارض و چشم و لب کے
یہ حدیثِ گل و شہلا و سمن جانتے ہیں

یہ الگ بات نہیں آئی زمانہ سازی
ہم مگر خوب زمانے کا چلن جانتے ہیں

رقصِ زنجیر کے آہنگ پہ ہوتا ہے سوا
رمز لیکن یہ کہاں زمزمہ زن جانتے ہیں

باغباں بھی ہے تصرّف میں شریکِ گلچیں
اس حقیقت کو کئی اہلِ چمن جانتے ہیں

لفظ و تخیّل کو جو کر نہ سکے ہم آہنگ
شوکتؔ اس شخص کو ہم خارجِ فن جانتے ہیں

ہم کچھ آگاہ نہ تھے رسمِ جہاں سے پہلے
درد کے بعد دوا، ضبط فغاں سے پہلے

سائے کی طرح ہے آغوش بدن سے آگے
دیکھئے کون ملے دشمنِ جاں سے پہلے

مبتلا کشمکشِ سُود و زیاں میں کب تھی
زندگی واہمۂ سُود و زیاں سے پہلے

میں بھی تو مرکزی کردار ہوں تیری مانند
یہ کہانی کروں آغاز کہاں سے پہلے

تیرے بعد آئی نہ پھر لوٹ کے گلشن میں بہار
مستقل ہم نہ تھے وابستہ خزاں سے پہلے

دم بخود دیکھ کے جلّاد سروں کا انبوہ
پھر بپا شور یہ مقتل میں "یہاں سے پہلے"

دل کے چقماق میں تھے آگ کے بیج افزودہ
شوکتؔ اس برف کے نم زاد سماں سے پہلے

عجیب بات ہے دن بھر کے اہتمام کے بعد
چراغ ایک بھی روشن ہوا نہ شام کے بعد

سناؤں میں کسے رودادِ شہرِ ناپرساں
کہ اجنبی ہوں یہاں مدّتوں قیام کے بعد

خرد علیل تھی دورِ شراب سے پہلے
قدم میں آئی تھی لغزش شکستِ جام کے بعد

ستم ظریفیٔ تاریخ ہے کہ مسند گیر
سدا خواص ہوئے انقلابِ عام کے بعد

حباب سوچ کے کیا ہم رکابِ موجِ ہوا
کہ بیٹھ جانا تھا جب ایک آدھ گام کے بعد

رہے چراغ دریچے میں، در کھلا رکھنا،
مسافر آن نکلتے ہیں بعض شام کے بعد

کبھی کبھی تو ہو شوکت شدید یہ احساس
کہ ہم طیور قفس میں پڑے ہیں دام کے بعد

○

بھولتے جاتے ہیں یادوں میں سمانے والے
جیسے اب واقعی رخصت ہوئے جانے والے

سائے کے واسطے تعمیر کریں گے پھر لوگ
دھوپ کے واسطے دیوار گرانے والے

رائیگاں عہد پسِ عہد گئی ــــ قربانی
خوں بہا لے گئے خود خون بہانے والے

وقت کو ساتھ لیے آئے یہاں تک ہم ہی
ہو گئے لوگ ہمیں اگلے زمانے والے

یہ جہاں ایک بڑے کھیل کا پس منظر ہے
سب نظر آتے ہیں کردار فسانے والے

یا تو سقراط ہے اب مصلحتاً مُہر بلب
لوگ ہی مر گئے یا زہر پلانے والے

جو زمانے کی سماعت پہ گراں لگتی ہے
ہم تو شوکتؔ ہیں وہی بات سنانے والے

JAMIA MILLIA ISLAMIA LIBRARY New Delhi
MALHOTRA COLLECTION

○

ہم عزیز اس قدر اب جی کا زیاں رکھتے ہیں
دوست بھی رکھتے ہیں تو دشمنِ جاں رکھتے ہیں

طبعاً انسان تو دلدادۂ فصلِ گُل ہے
ہم عجب لوگ ہیں جو ذوقِ خزاں رکھتے ہیں

عارضِ گُل ہو، لبِ یار ہو، جامِ مے ہو
جسم جل اٹھتا ہے ہم ہونٹ جہاں رکھتے ہیں

واقعہ یہ بھی ہے حق بات نہیں کہہ سکتے
یہ بھی دعویٰ ہے بجا منہ میں زباں رکھتے ہیں

جس جگہ دل تھا وہاں حسرتِ دل باقی ہے
جس جگہ زخم تھا اب ایک نشاں رکھتے ہیں

ہم سے کر جاتا ہے وہ شخص فریب آخر کار
جس کے بارے میں بھی ہم نیک گماں رکھتے ہیں

شوکتِ اسلوبِ غزل ہے متعیّن، تاہم
اس میں ہم منفرد اندازِ بیاں رکھتے ہیں

○

شبِ فراق تھی، ہم ذکرِ یار کرتے رہے
خزاں سے اخذ نشاطِ بہار کرتے رہے

نکل کے پھول سے بُو رم نہ کر سکے جیسے
ہم اپنے آپ سے ایسے فرار کرتے رہے

کبھی ثواب بھی سرزد ہُوا تو بے منشا
کبھی گناہ بھی بے اختیار کرتے رہے

صلیب لاتے رہے آپ اُٹھا کے مقتل تک
جو کر سکے وہ ترے جاں نثار کرتے رہے

جو بات برسرِ منبر نہ کہہ سکا واعظ
تمہارے دوست وہ بالائے دار کرتے رہے

بڑے وثوق سے دُنیا فریب دیتی رہی
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے رہے

اُفق کی طرح تھی منزل، گریز کرتی رہی
سفر طواف تھا، طے رہگذار کرتے رہے

تمام عُمر تری آرزو رہی ہم کو
تمام عُمر ترا انتظار کرتے رہے

کہاں گئے وہ ندیمانِ خاص جو شوکت
ہمیشہ عہدِ وفا استوار کرتے رہے

ابیات

ہم نبرد آزما تھے دُشمن سے
دوست نے بھی محاذ کھول دیا

وہ مُصِمّم دشمنی پر، دوستی پر یہ مُصِر
اِن میں اک صورت بھی میری جانی پہچانی نہیں

○

جب کہیں گیسوئے جاناں نہیں لہرائیں گے
سفرِ زیست کے راہی کہاں سستائیں گے

ہم اگر رند نہیں راندۂ ہستی ہوں گے
گر اُٹھے بھی درِ ساقی سے، کہاں جائیں گے

ہم تری بزم سے یہ سوچ کے لوٹ آئے ہیں
تو زمانے کو ذرا دیکھ لے، پھر آئیں گے

خود فراموشئ جاں کا وہ سماں طاری ہے
تری آغوش میں بھی ہم نہ تجھے پائیں گے

ہائے وہ سرو سے قامت کہ خمیدہ ہونگے
ہائے وہ پھول سے رخسار کہ مُرجھائیں گے

سر جو زانو پہ ہے، ہو گا وہی نیزے پہ بلند
جو بدن گود میں ہے، دار پہ لٹکائیں گے

مے بہ اندازۂ پیمانہ ہے، غم بے اندازہ
شوکتؔ اندک پہ پئیں گے، وہ فزوں کھائیں گے

○

غم میں خوشی، خوشی میں کبھی غم بدل گئے
باہم خواصِ شعلہ و شبنم بدل گئے

اے عمرِ رائیگاں نہ کھلا غنچۂ مراد
پلٹی کئی رُتیں، کئی موسم بدل گئے

دیرینہ طبع لوگ ہیں ہم تو روا یتاً
بدلے بہت زیادہ اگر کم بدل گئے

تیری نگاہ ہی نہ مِری جاں بدل گئی
محسوس ہو رہا ہے دو عالم بدل گئے

دشمن تھے وضعدار، تھے وہ معتبر رفیق
جو ساتھ ساتھ وقت کے پیہم بدل گئے

اک سانحہ سہی یہ دلوں کی لطیف ضِد
کچھ دوست غیر ہو گئے کچھ ہم بدل گئے

شوکت نہیں پڑا کوئی نظمِ چمن میں فرق
گُلچین و باغبان تو باہم بدل گئے

ورائے جسم و جاں یا ماورائے جسم و جاں ہم ہیں
بتائیں کیا کسی سے مل کے اے شوکت کہاں ہم ہیں

نئے کوزے کی صورت جام میں بھرنا نہیں ممکن
مگر اس آنکھ کی ہر کیفیت کے ترجماں ہم ہیں

ہمیں سے اکتسابِ سوز بھی کرتے تھے پروانے
تمہاری بزم میں تو شمعِ کشتہ کا دھواں ہم ہیں

ہمارے دم سے تیری ذات کا ابہام واضح ہے
ترے خاموش احساسات کی گویا زباں ہم ہیں

کہیں بُو اپنی مٹی کی بھی جا سکتی ہے سانسوں سے
اگرچہ عطر آلودہ فضا ہے یہ جہاں ہم ہیں

اجل ہے یا ترا آغوش ہے یا نیند کی وادی
جہاں آرام سا آنے لگا ہے اب، وہاں ہم ہیں

بہار آلود ہونٹوں سے رہی ہے رسم ورہ شوکت
چمن ہائے معانی میں جو ایسے گل فشاں ہم ہیں

بدن ابھی ہے بدستور انتظار میں ، آ
کنار سے مرے محبوب اُٹھ کنار میں آ

اگر ہے سایہ اندھیرے کے بعد مل ضو میں
خزاں میں پھُول سا رخصت ہوا بہار میں آ

مصالحت کے لیے وقتِ نامساعد کیا
اگر ہے مصلحت ایامِ سازگار میں آ

بھٹک گئے تھے جہاں جان بُوجھ کر دونوں
سفر کریں وہیں آغاز رہگذار میں آ

ندامت ایسی بھی کیا اے ندیم رنجیدہ
پلٹ کے حلقۂ یارانِ غم گُسار میں آ

تو اس غرض سے بیابان کی طرف مت جا
درندگی کی ہے تحقیق تو دیار میں آ

ہے بامراد شریک ہجومِ بے ترتیب
معاشرہ نہیں شوکتؔ کہ تو قطار میں آ

○

المیہ بادہ کدے میں یہ مدام اپنا تھا
غیر کے پاس صبوحی رہی جام اپنا تھا

ایک بُت ہم نے تراشا ہُوئی شہرت اس کی
پہ کسی شخص کے لب پر بھی نہ نام اپنا تھا

سخت حیرت ہے سفر طے ہُوا منزل نہ ملی
تیز رَو قافلہ بھی گام بہ گام اپنا تھا

وائے ابلاغ وہ قاصد پہ ہُوا مہر نُما
اور جو اس نے دیا تھا' وہ پیام اپنا تھا

شغل یہ اُن کا' دھری تہمت خودغرضی و کِذب
صِدق و ایثار سے لیں کام ، یہ کام اپنا تھا

اِک حسینہ نے سُنایا ہے جو اپنائیت سے
مان ہی لیجیئے اِس کا یہ کلام اپنا تھا

خاص لوگوں کی سمجھ میں نہ ذرا بھی آیا
اِس قدر فن میں ہر اِک زاویہ عام اپنا تھا

ٹوٹتا ہی نہیں وہ رشتۂ قُربت شوکتؔ
ایسا اِس شہرِ پشاور میں قیام اپنا تھا

○

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر شوکتؔ
کون سی بات پہ اس شہر میں ہم یوں خوش تھے
صرف احسان فراموش نہیں لوگ جہاں
بلکہ اک خاص روایت سے وہ محسن کُش تھے

ہم آ پھنسے جو پشاور میں کیا گلہ یُوسفؔ
قفس مقام ہے مرغانِ نغمہ زن کے لیے
○ — یُوسف (مخدوم یُوسف مرحُوم) اُردو سُبھا کے ایک ساتھی

کسی کی چشمِ سادہ یاد آئی
حریفِ جام و بادہ یاد آئی

ہُوئی ہر عافیت مدفون جس میں
وہ دیوارِ فتادہ یاد آئی

سوادِ دیر و کعبہ میں پہنچ کر
تری محفل زیادہ یاد آئی

کسی کو بے تمنا بھُول بیٹھے
کسی کی بے ارادہ یاد آئی

زمانے سے ہُوا دل تنگ جب بھی
وہ آغوشِ کشادہ یاد آئی

کبھی تجھ کو بھی اے صحبت فراموش
بہارِ جان دادہ یاد آئی

جو منزل چھوڑ کر آئے ہیں شوکت
وہی جادہ بہ جادہ یاد آئی

○

مے کا مُشتاق ہے دل آنکھ کا سودائی ہے
جذبۂ شوق بہ اندازۂ رعنائی ہے

انجمن میں بھی کسی انجمن آرا کے بغیر
دل سے تا حدِّ نظر عالمِ تنہائی ہے

سارا ماحول رنگ افزود ہے پروانوں سے
شمع کو واہمۂ انجمن آرائی ہے

شہر میں رہ کے یہ احساس ہوا ہے کہ خوشی
دُور دیہات میں بجتی ہوئی شہنائی ہے

ہائے وہ حُسن کہ چڑھتی ہوئی کرنوں کی اڑان
آہ یہ شوق کہ ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے

شہرِ گُل، انجمنِ ماہ وشاں، کوئے مغاں
دل کہیں بھی ہو مگر تیرا تمنائی ہے

شوکتؔ اشکوں سے کیا خاکِ بدن کو سیراب
نہر نکلی ہے تو اس تھل میں بہار آئی ہے

جو تتلی پھول تک آئی، بہت ہے
ذرا سی بھی شناسائی بہت ہے

کشش تو ذات میں ہوتی ہے ورنہ
کئی جسموں میں رعنائی بہت ہے

مبارک انجمن آرائی تم کو
ہمیں یہ کنج تنہائی بہت ہے

محبت میں ہے کم کم نیک نامی
بہت ہے اس میں رسوائی بہت ہے

بنا یہ دیس ایسی جھیل جس میں
کنول اک آدھ ہے، کائی بہت ہے

گھر آجاتے ہیں پھر کر سارا بازار
تہی دامن سے کم مہنگائی بہت ہے

کسی اپنے نے شوکتؔ فی زمانہ
توجہ کچھ بھی فرمائی۔ بہت ہے

○

دشمنِ جاں وہ گاہ گاہ ملے
اور بن بن کے خیر خواہ ملے

خُوب جی بھر کے سرزنش کیجیے
یوں بھی کچھُ لذتِ گناہ ملے

بسکہ جمہُوریت کے ناتے بھی
حکمراں بن کے بادشاہ ملے

لاکھ قانون منصفانہ ہے
اہلِ قانون سے پناہ ملے

مان لو ہنس کے جُرمِ ناکردہ
جب خلاف اک حسیں گواہ ملے

بحث موضوعِ عشق پر جب ہو
تُم سے کیا نقطۂ نگاہ ملے

رائیگاں بھی گئی سبق شوکتؔ
زندگانی میں جاں گاہ ملے

تری آنکھ سے ہے دل کو طلبِ سرورِ بادہ
کہیں عشق بن نہ جائے یہی آرزوئے سادہ

ترے ہونٹ کے کنارے لبِ جام سے زیادہ
کہاں عینِ رنگِ بادہ ، کہاں عکسِ رنگِ بادہ

تری طرح دوستی سے مجھے کب گریز ممکن
ترا شوق بالارادہ ، مرا عشق بے ارادہ

تری بے توجہی میں ہے ضرور کچھ توجہ
مرا سوز ورنہ کیوں ہو کبھی کم کبھی زیادہ

ہے جبینِ گلستاں سے شکنِ خزاں رمیدہ
کہ ہر ایک پھول طبعاً ہے یہاں بہار زادہ

نہ تھا اپنی ذات عالی کے لیے پسند تجھ کو
مری روح پر لپیٹا جو یہ جسم کا لبادہ

ہے شعُور کا مزاحم کبھی زہر کا پیالہ
ہے جنوُن کے مقابل کبھی دار ایستادہ

کوئی تو شکست مانے کہ ازل سے رُوبرو ہیں
ترا دستِ فیض افشاں، مرا دامنِ کشادہ

خم و پیچِ رہ سے شوکتؔ نکل آئے ہم سلامت
کوئی حادثہ نہ گذرے سرِ مستقیم جادہ

ابیات

مصلوب ہو کے جو نہ اتارے گئے ہیں ہم
اپنے خدا کے زعم میں مارے گئے ہیں ہم

○

بہتے دریا میں نظر آئے ہر اک بوند الگ
یہ نہیں چشم رسا بوند میں دریا دیکھے

تجھ سا دکھا سکی نہ کوئی گلبدن ہمیں
لے کر پھری بہار چمن در چمن ہمیں

وہ ایک عام شخص کے ہمراہ چل دیا
کیا خاص اپنے آپ سے تھا حسنِ ظن ہمیں

اے یارِ بے تپاک دلآرائے کم سلوک
دے تربیت، سکھا یہ تغافل کا فن ہمیں

آتا ہے یاد ایک بہار آفرین شخص
جس نے رکھا خزاؤں میں بھی نغمہ زن ہمیں

ہم کو ہمیشہ ان کی تھی دل بستگی عزیز
باتیں سُنا گئے ہیں جو یہ دلشکن ہمیں

تصدیق سب کریں گے حوالے سے آپ کے
الزام دیجئے نہ سرِ انجمن ہمیں

بارِ اِک، بیاض اس سے معنون نہ کرنے دے
شوکتؔ جو دے گیا ہے یہ طرزِ سخن ہمیں

نہ تھا ہمیں غمِ جاناں کا خاص اندازہ
بدن کے ساتھ بکھرتا ہے جاں کا شیرازہ

ترے جمال کا بھی واں نہیں ہوا شہرہ
جہاں ہماری محبت کا تھا نہ آوازہ

میں خود اثاثہ ہوں، چوری کا ڈر نہیں رہتا
جو گھر سے جاؤں، مقفّل کروں نہ دروازہ

زمیں کے جسم کا سب رس نچوڑ کر انساں
چلا ہے چاند کے چہرے کا نوچنے غازہ

ہمارے کھیل کا یہ کربیہ ہے اے شوکتؔ
تمام کہنہ ہیں کردار، داستاں تازہ

ق

کب مَیں نے یہ کہا ہے کہ ماحول ہے خراب
کب مَیں نے یہ کہا کہ فضا زہرناک ہے
محسوس یہ ہُوا ہے مگر اس دیار میں
دشمن کا دوستوں سے کوئی اشتراک ہے

○

○

دل و نگاہ میں حائل ہے فاصلہ کیا ہو
نہیں ہے عشق بھی سالارِ قافلہ، کیا ہو

رہے ہیں آپ بھی ہم عمر بھر کہاں اپنے
عزیز کوئی ہُوا غیر، تو گلہ کیا ہو

جُھکے نہ ہم تو زمانے نے ہم کو توڑ دیا
اَب اس سے بڑھ کے کسی کا مقابلہ کیا ہو

بدن کے بعد ہُوئی رُوح بھی اسیر اس کی
دراز زلف کا اَب اور سلسلہ کیا ہو

قمیص عصمتِ یُوسفؑ کی کیا سند بنتی
جو مدعی بنے منصف تو فیصلہ کیا ہو

ہُوئے حریف بھی چھوٹے دل و دماغ کے لوگ
اب ان کے ساتھ ہمارا معاملہ کیا ہو

ہمارے دم سے اندھیرے تلف ہوئے شوکتؔ
اب اور روشنیٔ طبع کا صلہ کیا ہو

تھی جس کی اوٹ لو پہ وہ دامان اُٹھ گیا
تھوڑی سی روشنی کا بھی امکان اُٹھ گیا

آیا یقیں خُدا پہ شکستِ اُمید سے
خود اپنی ذات سے مگر ایمان اُٹھ گیا

باقی ہیں صرف آدم و حوّا کی میتّیں
اترا تھا جو بہشت سے انسان اُٹھ گیا

وہ شخص دل میں بیٹھ گیا درد کی طرح
کر کے کنارِ شوق جو ویران اُٹھ گیا

حق بات کہہ کے ہم تو پشیمان ہو گئے
ہم پر ہزار طرح کا طوفان اُٹھ گیا

کیوں روز کے ملاپ سے رنجش بڑھائیں ہم
باہم جب اعتماد مری جان اُٹھ گیا

شوکتؔ ہماری ایسے مسافر کی ہے مثال
رستے میں جس غریب کا سامان اُٹھ گیا

گردِ رہِ کارواں رہے ہیں
ہم منزلوں کے نشاں رہے ہیں

کچھ ہم بھی رہے ہیں اپنے دشمن
کچھ آپ بھی مہرباں رہے ہیں

کشتی ہی نہ لگ سکی کنارے
دریا تو بہت رواں رہے ہیں

جب تم ہمیں یاد آ گئے ہو
اے دوست تو ہم کہاں رہے ہیں

معلوم ہوا کہ جانِ جاں تک
حائل ہمیں درمیاں رہے ہیں

اب یوں نہ یہ بستیاں اُجاڑو
کچھ لوگ کبھی یہاں رہے ہیں

شوکتؔ وہی حسن و عشق کے گیت
ہم بھی تو فسانہ خواں رہے ہیں

ہم سفر رہ میں ہوئے گر سرِ منزل نہ ملے
رل گئے ہیں بڑے آساں جو بمشکل نہ ملے

ہم بچھڑ جائیں تو ممکن ہے کچھ اخلاص بڑھے
مدتوں ساتھ رہے دوستو اور دل نہ ملے

مندمل یہ تو ہوئے جاتے ہیں رفتہ رفتہ
زخم سینے میں ہمیں داد کے قابل نہ ملے

جو نہ گردابِ بلاخیز کا ہم رقص ہوا
اس سفینے کو خدایا کبھی ساحل نہ ملے

مستقل چلتا رہے قافلۂ شوق و طلب
مجھ کو تو، رند کو مے، قیس کو محمل نہ ملے

بارہا ہم رہے ہنگامۂ عالم میں شریک
بارہا کشمکشِ ذات میں شامل نہ ملے

ہم تو سر اپنا ہتھیلی پہ رکھے تھے شوکت
یہ الگ بات کہ اس شہر میں قاتل نہ ملے

بکھرے تو پھر بہم مرے اجزا نہیں ہوئے
سرزد اگرچہ معجزے کیا کیا نہیں ہوئے

جو راستے میں کھیت نہ سیراب کر سکے
کیوں جذب دشت ہی میں وہ دریا نہیں ہوئے

انسان ہے تو پاؤں میں لغزش ضرور ہے
جُرم شکست جام بھی بے جا نہیں ہوئے

ہم زندگی کی جنگ میں ہارے ضرور ہیں
لیکن کسی محاذ سے پسپا نہیں ہوئے

انساں ہیں اب تو مدتوں ہم دیوتا رہے
شکلیں نہیں بنیں جو ہیولیٰ نہیں ہوئے

ٹھہرو ابھی یہ کھیل مکمل نہیں ہُوا
جی بھر کے ہم تمہارا تماشا نہیں ہُوئے

شوکتؔ دیارِ شوق کی رونق انہی سے ہے
جو لوگ اپنی ذات میں تنہا نہیں ہُوئے

○

یوسفؑ کی طرح کیوں کوئی بازار میں آئے
جو نرخ بھی اب طبعِ خریدار میں آئے

ملتی ہی نہیں قیدِ تمنّا سے رہائی
ہم کس قفسِ بے در و دیوار میں آئے

بن بن کے سوانح مری ہر واقعہ گذرا
سب لوگ سمٹ کر مرے کردار میں آئے

وہ عشق نہیں ہے کہ ہویدا ہو نظر سے
اخلاص کہاں معرضِ اظہار میں آئے

بندوں کے تصرف میں سہی رزق، خدایا
آئے تو یہ ہم تک کسی مقدار میں آئے

نیلام کیا بھی تو قلم کے نہ اُٹھے دام
اوصاف سب اس عہد کے تلوار میں آئے

پھرتا ہوں لئے جنسِ وفا شہر میں شوکتؔ
شاید نظرِ صاحبِ معیار میں آئے

سارے تن پہ ڈنک کھا کر ہیں بہت حیران ہم
ڈھونڈتے تھے بچھوؤں کے شہر میں انسان ہم

مضطرب تم کیوں ہو، یہ تو احتیاطاً پھر ذرا
دشمنوں کی کر رہے ہیں دوستو پہچان ہم

لازم آئی عمر بھر اس کی پذیرائی ہمیں
ایک دو دن کے لیے جس کے بنے مہمان ہم

جانتے ہیں آپ اس خوں کا کریں گے کاروبار
صدق سے ہوتے ہیں پھر بھی آپ پر قربان ہم

کیسی یک طرفہ وفاداری میں دشواری ہوئی
جانتے تھے اس مہم کو جانِ جاں آسان ہم

زندگی کے واتے ملتے ہیں سبق کس عمر میں
پورا کر سکتے نہیں جب کوئی بھی نقصان ہم

شوکت اک فتوےٰ سے یہ زائل نہ ہو جائے کہیں
شیخ کے پاس اس لیے رکھ آئے رہن ایمان ہم

○

ہُوا ہے دیکھتے ہی دیکھتے شباب یہ کیا
خنک ہے جیسے کوئی شعلۂ جمالِ حنا

جمُودِ ظلمتِ ابہام ہے محیط حواس
نمودِ صبح کی مانند مسکراؤ ذرا

حریم دل میں تمنّا طواف کرتی رہی
تمام عُمر، نہ معلوم ہو سکا کس کا

نظر کے ساتھ ہے پیوست آئنہ کوئی
کہ دیکھتا ہوں تماشا ھر ایک سمت اپنا

وثوق سے متعین کرے جو سمتِ حیات
ہر اک برس اسی ساعت کا انتظار رہا

کسی نے کس کی توجہ سے کوئی بات سُنی
کہا ہے ہم نے کبھی کچھ یہاں تو آپ سُنا

نہیں ہوئے ہیں کبھی اپنی ذات سے گمراہ
ہر ایک شخص دکھائی دیا ہمیں اچھا

تمام طاقتِ برداشت چھین لی جیسے
ملا ہے جب کوئی ہمدرد، درد اور بڑھا

ستم ظریفئی تقدیر دیکھنا شوکتؔ
رواں ہوا جو سفینہ، ٹھہر گیا دریا

بیت

جن کا معیارِ عزم ہو منزل
ہم انہیں ہم سفر نہیں کرتے

اس قدر ہم کو ملے ہیں آدمیت کے حریف
شوکتؔ اب ہوتی ہے وحشت آدمی کے نام سے

مثلِ فانوس کہاں دھر لیے دامن میں چراغ
ہم بھی ہمراہ چلے گہر لیے دامن میں چراغ

طبع میں تیری توجہ سے یہ جولانی ہے
پرتوِ خور سے ہیں اختر لیے دامن میں چراغ

ہمتیں پست ہوئی ہیں تو تمہیں یاد کیا
جب ہَوا تُند چلی کر لیے دامن میں چراغ

تھی ہوائے لب و رخسار ہمیں کچھ ایسی
جان کر شعلۂ گُل بھر لیے دامن میں چراغ

گُل کرے گی جو گُلِ تر کے دیئے تیز ہَوا
شاخ آئے گی مکرر لیے دامن میں چراغ

جب جلی آنکھ کی قندیل تو مے سرد پڑی
رہ گئے بزم میں ساغر لیے دامن میں چراغ

خوب لگتے ہیں چراغوں سے مزّین در و بام
ہو گئے راکھ کبھی گھر لیے دامن میں چراغ

بچ گئے منتِ فانوس گراں سے ہم لوگ
دو گھڑی بھی نہ جلے، مر لیے دامن میں چراغ

سامنا تند ہواؤں کا بھی ہو گا شوکتؔ
تم چلے تو ہو سڑک پر لیے دامن میں چراغ

ابیات

زندگی بھر خیر دیتا ہے کسی کا ساتھ کون
ہاں مگر کچھ جانے والے یاد آتے ہیں بہت

کِیا ہے درد بھی برداشت اک اصُول کے ساتھ
شریکِ بزم نہیں ہوں دلِ ملول کے ساتھ

○

نظر سے رُوئے سخن ہے لبوں سے روئے خیال
مئے جمال سے لبریز ہے سبُوئے خیال

کوئی روانہ ہے پھر رہگذارِ ماضی پر
کسی کی چاپ ہے نغمہ سرائے کوئے خیال

ترے خیال سے بے داغ ہے ضیائے بدن
ترے جمال سے وابستہ آبروئے خیال

گلہ طرازئ ناقدرئ زمانہ کیا
سنا کریں گے ہمیں آپ گفتگوئے خیال

کہاں سے لائیں تمنائے قلب کا محبُوب
کہاں پہ ڈھونڈیئے مقصودِ آرزوئے خیال

وصال و قرب کے نشّے حریفِ ہوشِ سخن
فراق و ہجر کی کیفیتیں عدوئے خیال

بہار اب کے برس ہے جہان و جاں افزا
ہے ساتھ ساتھ نموئے گُل و نموئے خیال

نظر خود اپنی ہی کوتاہیوں پہ رہتی ہے
نہ سُوئے ظن ہے کسی سے ہمیں نہ سُوئے خیال

اُتر کے دیکھیے شوکت ضمیرِ انساں میں
تنک محیطِ تمنا، وسیع جوئے خیال

ابیات

یہ بھی ہے واقعہ مری بگڑی نہ بن سکی
یہ بھی درست ہے کہ خدا کارساز ہے!

نمائش گاہ میں کیجیے مصوّر کو بھی آویزاں
مکمل اک نمونہ ہے فنِ تجرید کا وہ بھی

○

غالبؔ میرؔ اقبالؔ بنے ہیں، ہم کرتے ہیں سب کی بات
خود کہنے سے کیا ہوتا ہے، دُنیا مانے تب کی بات

جس کو دیکھو پیٹ سے باہر پاؤں نکالے، ٹھیگرہے
لڑکے بالے بھُول گئے ہیں شرم لحاظ ادب کی بات

چتون بھالا، نین بجریا، لَٹ سنپولی، ہونٹ سندور
اس بالم کی بات نہ پوچھو، ہر اک روپ غضب کی بات

ہائے وہ رُت جب ہر چھایا میں آنکھ کرن بھر دیتی تھی
اب پھیکی لگتی ہے نشیلے نین، رسیلے لب کی بات

پہلے پھُول تھے ہم، پھر پھُولوں پر بھنورا، اب کانٹا ہیں
کڑوے بول بڑے مت مانو! اب مت بھالو تب کی بات

پاکستاں میں سناؤ درخانئ کا سندرہ، گاؤ ہیر
کیا بھارت کی شکنتلا بانی، کیوں لیلائے عرب کی بات

شوکتؔ کس کی ڈفلی پہ یہ راگ پرائے گاتے ہیں
حسرت ہے کبھی ان یاروں سے ہم سنتے اپنے ڈھب کی بات

عشق صادق ہے تو بے پروا سب اندیشوں سے ہے
یہ کبھی کچے گھڑوں سے ہے، کبھی تیشوں سے ہے

ہے اگر امکاں وہاں اک آدھ آدم خور کا
شہر تو اس سلسلے میں بیشتر بیشوں سے ہے

ہے گلے کے واسطے رسی تو کیا پڑتا ہے فرق
ریشمی دھاگوں کی ہے یا سُوت کے ریشوں سے ہے

حق کریں تسلیم لیکن دب نہیں حق دار کو
سابقہ اس ملک میں ایسے ستم کیشوں سے ہے

بادشاہِ وقت پر افشا کبھی ہو جائے گا
قائم اس کی سلطنت ہم ایسے درویشوں سے ہے

ہو گئیں مجہُول اِنسانی مراسم داریاں
غیر سے قطع نظر کون آج خوش خویشوں سے ہے

شوکتؔ ایسا بن گیا ہے عشق اب اپنی شناخت
ذات کی پہچان جیسے آج بھی پیشوں سے ہے

گھروں سے نکلے ہیں منہ سے نقاب اٹھائے ہوئے
ہوا کے رُخ پہ چلے وہ دیئے جلائے ہوئے

ہماری راہ جو اب روکتے ہیں کانٹوں سے
خود اپنے ہاتھ کے پودے ہیں یہ لگائے ہوئے

بصد گمان جنہیں بزم سے کیا ہے وداع
بصد یقین تمہارے ہی تھے بلائے ہوئے

جب اپنے قد سے زیادہ دراز ہونے لگے
غروب ڈھلتی ہوئی روشنی میں سائے ہوئے

زمانہ ایک روش پر کبھی نہیں رہتا
مرے عزیز تھے یہ لوگ جو پرائے ہوئے

جگہ رہی ہے ہماری اُنہی کی آنکھوں میں
ابھی جو پاس سے گذرے نظر بچائے ہوئے

پلٹ کے آئیں گے پھر ہمصفیر خوش موسم
ہیں شوکت اپنے یہ احباب آزمائے ہوئے

جو کچھ ہوا خبر ہے اسی کی رضا سے ہے
ہم کو گلہ کسی سے نہیں ہے خدا سے ہے

جنت میں مطمئن ، نہ جہنّم میں مضطرب
پروردہ دل زمین کی آب و ہوا سے ہے

دشمن ہے آدمی کا ازل سے خود آدمی
یعنی مقابلہ یہ بلا کا بلا سے ہے

ہر غیر سے تو خوب گذارا کیا۔ مگر
اے دل معاملہ ترا اب آشنا سے ہے

ہے ذوق کا جمال سے آگے معاملہ
ربطِ نگاہِ شوق تمہاری ادا سے ہے

پھیلایئے سلوک کا ہم تک بھی دائرہ !
مطلب روا سے ہے نہ غرض ناروا سے ہے

ہوں منفعل کہ بارِ دگر ہاتھ اُٹھ گئے
دل منحرف دعا سے نہیں، مدعا سے ہے

قدسی کرے قبا بشریت کی زیبِ تن
گر واقعی مراد کوئی ارتقا سے ہے

شوکت قلم عدو کے تصرف میں آ گیا
فن میں بپا یہ معرکہ تو ابتدا سے ہے

بیت

خدا سہی ترا رزاق، مرغِ زیرک دیکھ
نہ ہو یہ حیلۂ صیاد آب و دانہ کہیں

بیت

بحر میں ڈھونڈتی پھرتی ہے وجود اب اپنا
بوند کو راس نہ تھا ہمدمِ طوفاں ہونا

ہم اہلِ رُوح بدن پر عقیدہ رکھتے ہیں
پس آرزوئے لب و زلف و دیدہ رکھتے ہیں

اگرچہ اب یہ پرندے قفس سے باہر ہیں
پہ نفسیات وہی پر بریدہ رکھتے ہیں

گذر گیا ہے جنوں منزلِ گریباں سے
کہ اب بہار میں ہم دل دریدہ رکھتے ہیں

کسی سے کوئی توقع نہیں رہی جب سے
کسی سے ہم نہیں خاطر کبیدہ رکھتے ہیں

بہ فیضِ طرۂ دستار شہر کے ٹھگنے
ہیں مدعی قد و قامت کشیدہ رکھتے ہیں

بصد وثوق کہیں جھوٹ پڑھ کے بسم اللہ
امامِ وقت یہ وصفِ حمیدہ رکھتے ہیں

برائے حلقۂ احباب کچھ نہیں معیار
حریف اپنے مگر چیدہ چیدہ رکھتے ہیں

یہ عشق ہے، کمک اس میں بہم نہیں آتی
کریں، جو حوصلہ اس کا جریدہ رکھتے ہیں

یہاں ہم آدمیوں میں رہے مگر شوکتؔ
لگے کہ سارا بدن سگ گزیدہ رکھتے ہیں

بیت

دوست تو خیر غلط ہی تھا مگر وہ شوکتؔ
جب مخالف ہُوا دشمن بھی کمینہ نکلا

بیت

ہم کو ہے درکِ نیم شبی و سحر گہی
دنیا مگر نہ فرصتِ یک آہ و نالہ دے

شوق بھی بن گیا ہے پیشہ ہوس رانی کا
لطف ہی اب نہیں یاروں کی غزلخوانی کا

آج ہے کیسی زلیخاؤں میں یوسف نیلام
عام آوازہ ہے بازار میں ارزانی کا

بادشاہی کے خد و خال کی رونق ہے وہی
دَور کہنے کو ہے جمہور کی سُلطانی کا

شاخِ گُل ڈستی ہے افعی کی طرح نظروں کو
اب تو وحشت میں یہ عالم ہے پریشانی کا

وائے وہ موسمِ گُل جس میں خزاں یاد آئے
ہائے یہ نقشہ بھرے شہر میں ویرانی کا

لوگ کیا سادہ ہیں رکھتے ہیں طمع امرت کی
ان سے جو مرتے کو اک گھونٹ نہ دیں پانی کا

سنگ زن ہم پہ وہی طفل ہیں شوکتؔ جو کبھی
ہم سے لیتے تھے سبق چاک گریبانی کا

خود شناسی ہو تو ہر معجزہ امکان میں ہے
ایک چھوٹی سی خدائی ہر اک انسان میں ہے

تو اگر بعدِ خدا خود کو نہ سمجھے بر حق
پھر سمجھ لے کہ خلل کچھ ترے ایمان میں ہے

ہے مری جاں میں ترے جسم کی کیفیتِ لمس
گو مرے پاس ہے تو اور نہ مرے دھیان میں ہے

فصلِ گُل آئی تو ہم نذر کریں گے اب کے
وہ جو اک تار ابھی اپنے گریبان میں ہے

داستاں گو کو ترے ذکر سے فرصت تو ملے
نام میرا بھی اس افسانے کے عنوان میں ہے

دل نے رکھا نہ قدم شہرِ بدن سے باہر
ذات اس کے سبب آوارہ بیابان میں ہے

کوئی سمجھائے تو شوکت مرے چارہ گر کو
یہ بدن دیکھتا ہے اور خلش جان میں ہے

سارے سفر کے مرحلے آسان ہو گئے
کچھ حادثے قیام کے دوران ہو گئے

خُود اپنی شخصیت پہ چڑھا کر دبیز خول
ہم لوگ اپنے واسطے انجان ہو گئے

وہ نعمتِ حیات تجھے جس پہ فخر ہے
ہم نے قبُول کی تو پشیمان ہو گئے

چہروں کے خال و خط میں ہے شادابیوں کا قحط
کتنے حسین شہر تھے، ویران ہو گئے

اب سانس کی یہ رو بھی سماعت پہ بار ہے
یہ پُر سکون دھارے بھی طوفان ہو گئے

ان کا دوام دل کے جریدوں پہ ثبت ہے
جو لوگ اک اصُول پہ قربان ہو گئے

جو بن گئے فرشتے اُنہیں اس پہ ناز ہے
شوکتؔ ہمیں یہ فخر کہ اِنسان ہو گئے

پھولوں سے بھرے باغ بھی ویراں نظر آئے
شہروں میں بہت کم ہمیں انساں نظر آئے

صیقل نہ کرو آئینے کیا اس کی ضرورت
کردار تو چہروں پہ نمایاں نظر آئے

کی ہے ثمر و گُل کی عجب پرورش اس نے
تا حدِّ نظر باغ بیاباں نظر آئے

کپڑے تو الگ جس نے بدن نوچ لیے ہیں
لو نام کہ وہ شخص بھی عریاں نظر آئے

حیرت ہے کہ حاصل جسے آرام بہت ہے
اتنا ہی زیادہ وہ پریشاں نظر آئے

روٹی کا اہم مسئلہ یہ ہے نہ ملے گر
تو ہاتھ سے جاتا ہوا ایماں نظر آئے

کافر بھی اس سے بڑا محتاط ہوں شوکتؔ
جو آدمی صورت سے مسلماں نظر آئے

دھرسے مٹنے کا غم بھی ہمیں بے جا ہوگا
ہم نہیں ہوں گے اگر کل، کوئی ہم سا ہوگا

دیکھ اس آنکھ کو، سن اس کا قصیدہ ہم سے
پھر یہ باتیں نہ کبھی ایسا تماشا ہوگا

سنتے آئے ہیں مگر بات ہے سب کہنے کی
تم برا گر نہیں کرتے کے تو اچھا ہوگا

اب تو ہم جھیل رہے ہیں یہ زمانے کے عذاب
حوصلہ ھی نہ رہا دل میں تو پھر کیا ہوگا

دفعتاً دل کو پسند آیا ترا کیا انداز
میں نے ورنہ تجھے پہلے بھی تو دیکھا ہوگا

آج تک ذہن میں حسرت کا غبار اڑتا ہے
آرزوں کا کبھی قافلہ گذرا ہوگا

اور کیا ہوگا پسِ پردۂ دل اے شوکتؔ
اپنی تصویر کا اک اور سراپا ہوگا

ختم ہو کے بھی رواں سلسلہ ہو سکتا ہے
سرِ منزل بھی تو گم قافلہ ہو سکتا ہے

منتظر وقت ہوا عدل کی میزان لیے
اب کسی لمحے کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے

بے حمیت نہیں ہو سکتا ہے انساں، لیکن
بعض حالات میں بے حوصلہ ہو سکتا ہے

کچھ شکایت بھی اگر ہے تو مقدر سے ہے
آپ سے اور مجھے ہو گلہ — ہو سکتا ہے؟

میرے نزدیک تو ہے وقت ضمیمہ میرا
اَبدیّت کا بھی ہو تکملہ، ہو سکتا ہے

تم انا بیع نہ سہی، رہن ہی رکھ دو چند ے
یوں بھی فن درخورِ وصف وصلہ ہو سکتا ہے

شوکتؔ اک لحظہ میں کیا جانئے کیا ہو جائے
آج اور کل میں بڑا فاصلہ ہو سکتا ہے

سہل کی تیرے تصوّر سے جُدائی ہم نے
عین دوزخ میں بھی فردوس بنائی ہم نے

نگہ دانجم و مہتاب کی رعنائی میں
شام سے صبح کی تمہید اُٹھائی ہم نے

قدر اَب آئی ہے جب بیت چکی ہے ساری
زندگی ہائے جو بے کار گنوائی ہم نے

تیرے دربار سے مایوس پلٹ آئے ہیں
اپنی دہلیز پہ اب دی ہے دہائی ہم نے

نہ بنی بات محبت کے حوالے سے نئی
کوئی دوشیزہ بھی موضوع بنائی ہم نے

نہ ہُوئی منجمد احساس میں کوئی تحریک
دیکھ لی کر کے بہت شعلہ نوائی ہم نے

زندگی خام خیالی میں گذاری شوکت
کی بھلائی کی توقع پہ بھلائی ہم نے

کچھ آبلہ پا گذر رہے ہیں
کانٹوں کے بدن نکھر رہے ہیں

دنیا کی ہزار یورشوں میں
ہم آپ کو یاد کر رہے ہیں

منزل پہ نہ چھوڑ جایئے یوں
ہم آپ کے ہم سفر رہے ہیں

دل درد سے ہو چلا ہے مانوس
زخم آپ ہی آپ بھر رہے ہیں

جینے کا دھرو نہ ان پہ الزام
ہر لمحہ جو لوگ مر رہے ہیں

کیوں پُوچھ رہے ہو مہرباں تم
دن رات مرے گذر رہے ہیں

وہ عشق کے اہل کب ہیں شوکتؔ
جو سُود و زیاں سے ڈر رہے ہیں

○

قلب و نظر کا قافلہ راہ طلب میں ہے
روئے نگار صُبح ابھی زلفِ شب میں ہے

بُو گل سے ، دود شمع سے ، ہم خُود سے پا گریز
ہر چیز ایک سعی رم بے سبب میں ہے

ساغر بلب بھی عالمِ صد کیف ساز تھا
لیکن جو لطف کیفیتِ لب بہ لب میں ہے

سُوئے سرود خانۂ مستاں نہیں خیال
ورنہ علاجِ درد حدیث طرب میں ہے

ہم سے محاسبہ ہے محبت کا بار بار
ورنہ یہ عیب ہے تو مری جان سب میں ہے

دراصل یہ ہے دیکھنے والے کی آنکھ میں
حُسن و جمال کا جو اثر تاب و تب میں ہے

شوکت ہے زر کے مول زرِ کم عیار اب
جو بھی کسی نے لکھ دیا شامل ادب میں ہے

ہم لے کے چراغ جا رہے ہیں
کیوں ٹھوکریں پھر بھی کھا رہے ہیں

یاں پھر نہ بنا لوں آشیانہ
شاخیں بھی وہ پس جلا رہے ہیں

تقریب تو ختم ہو چکی ہے
اب صاحبِ صدر آ رہے ہیں

جو آج ملے ہیں اجنبی سے
ہم سے کبھی آشنا رہے ہیں

دائم تجھے غمگسار سمجھا
کس وہم میں مبتلا رہے ہیں

ہم نے جنہیں بولنا سکھایا
باتوں میں ہمیں اُڑا رہے ہیں

شوکت جو ہیں بندگی میں ماخوذ
یہ لوگ کبھی خُدا رہے ہیں

اُجڑے ہُوئے دل میں بھی ترا دھیان رہا ہے
شہروں سے بھی آباد بیابان رہا ہے

ہم نے تجھے سو رنج میں چھوڑا تھا مگر دوست
دل ترکِ تعلق پہ پشیمان رہا ہے

شاید یہ کسی تازہ مصیبت کے ہے درپے
کچھ روز سے دل میرا کہا مان رہا ہے

ڈھونڈا جسے تا عمر کہیں وہ تو نہیں تم
ٹھہرو تو سہی دل تمہیں پہچان رہا ہے

جب وجہِ شکایت تھی بہم بات ذرا سی
باہم یہ دل اخلاص اسی دوران رہا ہے

تُم آج ہمارے نہیں بنتے ہو تو کیا ہے
لیکن کبھی اس بات کا امکان رہا ہے

شوکت عجب انداز کا ہے شہرِ بتاں دل
آباد ہوا ہے کبھی ویران رہا ہے

اک شخص کے سلوک پہ مت بھول جاؤ تم
شوکتؔ ہر ایک سے نہ تعلق بڑھاؤ تم

میرے سبب چلے تو ہو آزردہ دل حبیب
میرے سبب ہی پھر نہ کہیں لوٹ آؤ تم

ممکن ہے تم جو آؤ کبھی پھر وہ تم نہ ہو
ممکن ہے مَیں مِلوں بھی مجھے پھر نہ پاؤ تم

شطرنجِ عشق میں ہو مقابل وثوق سے
جیسے تمام جانتے ہو پیچ داؤ تم

اب کے وفا کی داد ہماری طرف سے ہو
اب کے خفا ہوئے ہیں اگر ہم، مناؤ تم

دنیا میں اور لوگ تو دشمن نہ دوست ہیں
توفیق دے خدا تو ہمیں کو ستاؤ تم

شوکتؔ کواڑ بھیڑ لو اب کون آئے گا
اُٹھو بس اب دریچے سے مشعل اُٹھاؤ تم

ہم یہاں پہ ایک دن بھی مطمئن زندہ نہیں
شکر کیجے زندگی دنیا میں آئندہ نہیں

وہ زمانہ اب کہاں کانٹے کو بھی اعزاز تھا
پھول بھی اب تو گلستاں کا نمائندہ نہیں

سر اگر پھوڑا کسی نے کیا مذمت کیجئے
آج کل دل توڑ کر بھی کوئی شرمندہ نہیں

حلقۂ احباب اف کیسا سمٹ کر رہ گیا
ہائے تھے کتنے ستارے اب جو تابندہ نہیں

میری چشمِ سالخوردہ کی صلاحیت گئی
یا تمہاری ذات ہی ویسی درخشندہ نہیں

کاروبارِ عشق میں دل ہے برابر کا شریک
اے مری خانم یہ اجرت دار کارندہ نہیں

ہم تو اے شوکت سمجھتے ہیں، تکلف برطرف
عشق پائندہ ہے، لیکن حسن پائندہ نہیں

کوئی ملنے کو نہ صورت جانی پہچانی بڑھی
شہر میں رونق ہوئی تو اور ویرانی بڑھی

عقل کی منطق سے بڑھ کر ہے جنوں نکتہ نواز
ہیں عیاں اسرارِ ہستی اب کہ حیرانی بڑھی

جس قدر بڑھتی گئی ہے عمر کم ہوتی گئی
جس قدر گھٹتی گئی ہے اور نادانی بڑھی

قابلِ ذکر اک یہی قصّہ ہے، آزادی کے بعد
اور پابندی ہوئی ہے، اور نگرانی بڑھی

کیا ہوا، کیوں سنگ در اپنی جگہ سے ہٹ گیا
اس پہ سجدے کے لیے جب میری پیشانی بڑھی

میرے بعد اب گرمیٔ محفل کے ہیں سب مدعی
بجھ گیا سورج تو پھر تاروں کی تابانی بڑھی

اک معمہ بن گئی شوکتؔ ہماری زندگی
بے سبب تسکیں ملی بیجا پریشانی بڑھی

کسی تمنا، کسی دعا میں اثر نہیں ہے
خدا یقیناً ہے، وہ ہمارا اگر نہیں ہے

عدو بھی رل جائے فی زمانہ کوئی مصمّم
رفیق تو خیر کوئی بھی معتبر نہیں ہے

یہ مسئلہ اور ہے کہ چُپ ہیں زباں داں سب
معاملہ یہ نہیں کوئی باخبر نہیں ہے

وہی ہے کیفیتِ اسیری محیط — اگرچہ
کھُلی ہے زنجیر، بند زنداں کا در نہیں ہے

رفاقتوں کی ہماہمی مُشترک بہت ہے
مگر دلوں کا تپاک باہمدگر نہیں ہے

روانہ کس قافلے کے ہمراہ ہو گئے ہم
مسلسل احساس ہے کوئی ہم سفر نہیں ہے

گر آدمی آدمی سے پائے امان شوکت
تو پھر کسی بھی مہیب آفت کا ڈر نہیں ہے

عذابِ سعیٔ مسلسل سے اب رہائی ہو
پلٹ کر اپنی ہی دہلیز تک رسائی ہو

مری کتاب کو یک دم قبولِ عام ملے
گر اہتمام سے تقریبِ رُو نمائی ہو

رہِ خلوص سے خوش پھر کب گذرتے ہیں
تمام عمر میں اک تم ادھر سے آئی ہو

ابھی کچھ اور رہے مشغلہ محبت کا
ابھی کچھ اور مرے یار بے وفائی ہو

اسے تو جیسے تبسم کا پڑ گیا لپکا
کلی کے سامنے تم جب سے مسکرائی ہو

عجب ہوا یہ چلی ہے وطن سے ہجرت کی
یہاں نہ رزق پہ تقدیر آزمائی ہو

ہمارے ناخنِ تدبیر اتار کر شوکتؔ
حریف اس پہ مصر ہیں گرہ کشائی ہو

دیکھنے سب یار کے کوچے میں میلے جائیں گے
دار تک لوگو مگر ہم ہی اکیلے جائیں گے

ہے تلون طبع میں تو اس محبت سے نہ مل
پھر تری فرقت کے دکھ ہم سے نہ جھیلے جائیں گے

خوش تصوّر یا کوئی خوش زاویہ تصویر کا
اور کیا ہم فن پرستار آپ سے لے جائیں گے

پیش قدمی کر چکے ہیں عزم سے اس کی طرف
ہم یقیناً اب نہیں پیچھے دھکیلے جائیں گے

ہم گئے اسٹیج سے تو ختم ہو جائے گا کھیل
رائیگاں شوکتؔ کئی کردار کھیلے جائیں گے

بیت

بپا ہے جشنِ نمائش مِری محبت کا
یہ تیرے حسن کی تقریبِ رونمائی نہیں

بیت

شوکت اپنی زندگی، اپنی ذہانت، اپنا فن
خطۂ اربابِ بے بہرہ میں غارت ہو گئے

○

بات ہے واضح مگر پھر بھی بتانی چاہیئے
اَب رعایا کو بھی کچھ دن حکمرانی چاہیئے

بندہ پرور آپ پھر ارشاد فرمائیں ضرور
اب کے لیکن کچھ ہمیں اپنی کہانی چاہیئے

اسوۂ ہجرت نہیں خانہ بدوشی کی روش
تا بہ کَے اس مُلک میں نقلِ مکانی چاہیئے

سبز قدموں نے دکھائے دل جُلوں کو سبز باغ
انقلاب اب ایک چھینٹا ارغوانی چاہیئے

آنکھوں آنکھوں میں جہاں پہ گفتگو ممنوع ہو
اس جگہ اظہارِ حق کھل کر زبانی چاہیئے

مضمحل پہلو کو اک مہ وش کے پہلو سے ملا
زندگی ہی سے علاجِ زندگانی چاہیئے

شوکتؔ ان سے بات کہ آواز اشک آلود ہے
ذہن بنجر ہو چکے ہیں ان کو پانی چاہیئے

یہ الگ بات ہے شوکتؔ کہ ہمیں قہر میں ہیں
ورنہ کچھ اور گنہ گار بھی اس شہر میں ہیں

اپنے الفاظِ تسلّی پہ ذرا غور تو کر
شکر آمیز ہیں یا تیر بجھے زہر میں ہیں

ظلم کا ہو گا اسی دہرِ مکافات میں عدل
تُو بھی اس دہر میں ہے ہم بھی اسی دہر میں ہیں

لہلہا دیتی ہے کھیتی کو جو کھر ساؤں میں
سیم اور تھور کے خطرے بھی اسی نہر میں ہیں

کیفیت کوئی الگ اب نہیں دیہات کی بھی
ناپسندیدہ روایات اگر شہر میں ہیں

وہ جو ساحل کی طرف لے کے چلی تھی کشتی
کس کو معلوم تھا طوفان اسی لہر میں ہیں

زندگی ــــ جیسے کسی دشت میں شوکتؔ ہم لوگ
کالے کوسوں کے سفر پر بھری دوپہر میں ہیں

○

یہ کون سی آدمی کو تو نے خدائی دی ہے
یہاں تو ہر اک نے زندگی کی دہائی دی ہے

ہوا مخاطب حبیبِ بے التفات آخر
کہ دل میں آواز سی ہمیں کچھ سنائی دی ہے

جو اس طرح چہ مگوئیاں ہیں مخالفوں میں
ضرور انہیں کوئی بات مجھ میں دکھائی دی ہے

نیاز مندی نہ عشق کو اس قدر عطا کر
جو حسن کو یہ ادائے بے اعتنائی دی ہے

ہمیں اذیت تو دی ہے اس دوست آدمی نے
مگر بہ تہذیبِ شیوۂ دلربائی دی ہے

قفس میں بھی اضطراب میں کچھ کمی نہیں تھی
اضافہ اس میں ہے اور، جب سے رہائی دی ہے

بھلائی پہ ہے عقیدہ قائم اگرچہ شوکتؔ
ہمیں تو اس کے عوض ہر اک نے بُرائی دی ہے

لے ان کے عقیدے پہ شہادت کوئی ہم سے
جو تیرے تجسس میں نکل آئے حرم سے

میرے دلِ تنہا میں نہ اب ڈھونڈیئے رونق
آباد تھا یہ شہر کسی شخص کے دم سے

کچھ ایسے ہمیں زیست نے برتا ہے کہ ہم کو
اب کوئی علاقہ نہ خوشی سے ہے نہ غم سے

ماں لوریاں دے دے کے سلاتی ہے تو بچے
اُٹھ بیٹھتے ہیں باپ کے چھوڑے ہُوئے بم سے

اب تو وہ زمانہ ہے فقیروں کا کریں بھیس
پھر بھی نہ توجہ ملے اربابِ کرم سے

اسلوب ہے جس کا مگر آدرش نہیں ہے
خوش اہلِ درو بست ہیں اس اہلِ قلم سے

شوکتؔ ہیں کئی اور بھی استاد یگانہ
ہم کو تو مگر فخرِ تلمذ ہے عدمؔ سے

ہے اختلاف، یہ کانٹوں پہ ہو کہ پھولوں پر
مفاہمت کبھی ہوتی نہیں اصولوں پر

نسیم لے اُڑی خاشاک کی طرح ان کو
بزعمِ خویش جو حاوی بنے بگولوں پر

غبی سفیہہ کی اک بات کو ملی ترجیح
کبھی ذہین خردمند کے مقولوں پر

فنا کی فصل تھی سائے اُگے بدن بن کر
کھنچیں تو خاک سی شکلیں کھنچیں ہیولوں پر

مبارک آپ کو مسند گداز پھولوں کی
بسر ہماری بھی ہو جائے گی ببولوں پر

برس رہی ہے گھٹا، پینگتی ہیں مٹیاریں
غضب ہے قوسِ قزح کی اٹھان جھولوں پہ

کوئی کرے نہ کرے سن کے اعتنا شوکتؔ
بلاغ ہی کی فقط شرط ہے رسولوں پر

○

کئی غنچے ابھی ہیں نا دمیدہ
بیابانِ کارِ فصلِ گُل رسیدہ

سفر جاری ہے خواہش کا مسلسل
یہ اک طائر ہے بے مصرف پریدہ

لباسوں سے کبھی کے ہاتھ گذرے
بدن بھی جا بجا اب ہیں دریدہ

عجب نظمِ معیشت ہے کہ ہر شخص
ہے مردم خور یا مردم گزیدہ

دوئی مذہب میں اس حد تک رہا ہے
خدا کے بعد ہو خود پر عقیدہ

بہانہ کر کے ترتیبِ چمن کا
ہر اک نے پھُول توڑے چیدہ چیدہ

ہوئی ہیں تجربہ ایک ایک شوکتؔ
محبت کی روایاتِ شُنیدہ

ضرورِ کیفرِ کردار ہے ستم رانو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا جانو

نہ اب جنوں کا محرک ہے سایۂ گیسو
نہ اب سکوں کا مکلف ہے تکیۂ زانو

یہاں جو عقل کے کچھ ضابطے ہیں داناؤ
تو قاعدے ہیں جنوں کے بھی چند نادانو

غُلام ہی کی بدولت ہے عیش خواجہ کا
دمِ کنیز سے ہے استراحتِ بانو

کبھی بہم تھا تعلق نیاز مندانہ
یہ اور بات ہے تم اب ہمیں نہ پہچانو

عجیب کور ہو ، خامی نظر نہیں آئی
امیرِ وقت میں کوئی تمہیں ثنا خوانو

وہ آج آئے ہیں شوکت تمہیں منانے کو
لو مان جاؤ ، بھلے آدمی ، کہا مانو

○

آپ کا عکس مرے دیدۂ بے خواب میں تھا
خوبصورت کنول اک ملگجے تالاب میں تھا

نُور جو آپ کی قندیلِ نظر سے جھلکا
محفلِ بادہ نہ جلوہ گہ مہتاب میں تھا

صدقِ نیّت سے جب آیا ترے ابرو کا خیال
سربسجدہ مرا دل سایۂ محراب میں تھا

ہر مکاں رہگذرِ رود میں کر کے آباد
ہر مکیں تشنہ بہ لب جستجوئے آب میں تھا

زیست دو آتشہ تھی جب متمکن وہ حسیں
ایسا سیماب صفت اس دلِ بے تاب میں تھا

شیخ کے واسطے از روئے شریعت مکروہ
جو روا میرے لیے عشق کے آداب میں تھا

انقلاب آئے بدستور مگر قائم ہے
فرق جو بوریا و بسترِ سنجاب میں تھا

زندگی گذری ہے عافیت و آفت میں سدا
سرِ ساحل تھا سفینہ، کبھی گرداب میں تھا

شوکتؔ اب ڈھونڈتے ہو ترکِ تعلق کر کے
وہ جو اک دشمن جاں حلقۂ احباب میں تھا

بیت

تھی کل اداس تری آنکھ آج سے کم ہے
ہر ایک روز نئے حادثے کا ماتم ہے

بیت

مرے لہو سے لکھی ہے جو داستاں تم نے
اشارۃً بھی تو اس میں مرا حوالہ نہیں

خلوص و مہر سے لبریز ہمدم اپنا تھا
کہ بیشتر وہ ہمارا تھا کم کم اپنا تھا

کیا جو تجزیہ نکلا نہ جانے کس کس کا
ہمیشہ جس کو سمجھتے رہے غم اپنا تھا

رسائی کیوں نہ ہوئی تا بگوئے یار اگر
تھی نیک نیت، ارادہ مصمم اپنا تھا

ہمیں ہمیشہ اسی مہرباں نے زک دی ہے
جسے ہمیشہ سمجھتے رہے ہم، اپنا تھا

کچھ اس طرح ہوئی تقسیم باغ ہستی کی
تمہارا خندۂ گل، اشکِ شبنم اپنا تھا

وہ ہم قدح تھا کہ پیرِ مغاں نہیں معلوم
ہمیں پیالے میں جس نے دیا سم، اپنا تھا

وہ شخص ہی مری پہچان بن گیا شوکت
جو آشنا کبھی اپنا نہ محرم اپنا تھا

لکھیں گے ہم کیسے تم نے بپا جو ہنگامے
ہماری اُنگلیاں بے شک ہوں خوں چکاں خامے

مذاق اُڑاتے ہیں ظالم برہنہ کانٹوں کا
پہن کر آتے ہیں جو پھُول خوش نما جامے

نہ سوز اب قلم ہے نہ ساز اب سخنے
ہے کامگار محبت بھی در ہمے دامے

عجب مزاج ہے یارِ ستم ظریف ترا
سدا جفا بسلامے، وفا بدشنامے

نہ دشمنوں ہی سے دشنام کا پیام کوئی
نہ دوستوں ہی سے آتے ہیں دل شکن نامے

پھر ایک زہد شکن ہم جلیس خلوت ہے
نظر نوازے، سخن پرورے، دلآرامے

نہ خوش دلی ہمیں شوکت یہ نیکنامی ہو
نہ بد دلی ہمیں شوکت کبھی بہ الزامے

ہے تو، لیکن نہیں خدا اپنا
یہ رہا ہے معاملہ اپنا

خاک سے خاک تک طویل سفر
یہ ہے احوالِ ارتقا اپنا

پھُول سے جب نکل گئی خُوشبو
پھر رہا اس کے پاس کیا اپنا

کوئی سنتا نہیں کسی کی بات
آپ سنتے رہو کہا اپنا

دُھوم تو کی نگر نگر تیری
مچ گیا شور جابجا اپنا

نہ رہا تیل تو چراغ بجُھا
کارنامہ کہے ہوا اپنا

آئنہ توڑ کر وہ کہتے ہیں
شوکتؔ اب دیکھ مُنہ ذرا اپنا

ہر نظر شوخ کی یوں دل میں ترازو نکلی
جیسے مٹیار کوئی ڈھونڈنے گبھرو نکلی

ہم سمجھتے تھے مہک تیرے بدن کی جس کو
جانِ من وہ تو مرے قرب کی خوشبو نکلی

جو ترے دل میں تھا خاموش نہاں میں نکلا
جو مرے سانس میں تھی نغمہ سرا تو نکلی

ہم نے آداب ملاقات سکھائے اس کو
تب وہ محبوبہ کہیں درخورِ پہلو نکلی

ہم بہت خوش تھے کہ وہ دوست فقط اپنا ہے
ہوئی تحقیق تو اس شخص کی یہ خو نکلی

یاد بے ساختہ آیا کوئی ماضی افروز
آنکھ اندھیرے میں پکڑنے کوئی جگنو نکلی

شوکتؔ اپنے تو ہر اک شعر کے پس منظر میں
کوئی خوش ذوق ادب شیفتہ مہ رو نکلی

نقطہ بیں ہم کسی اثرِ رنگِ بدن کے ہوں گے
اور دریافت کئی زاویئے فن کے ہوں گے

اخذ کر لیں گے شگفتہ لب و عارض سے بہار
ہم نہ بے فائدہ ممنونِ چمن کے ہوں گے

تو نہیں تھا جو غزلخواں مری تنہائی میں
دُور گھنگھرو تری پازیب کے چھنکے ہوں گے

لفظِ آتش لکھو سو بار تو کاغذ نہ جلے
فاش ہر اک پہ معانی نہ سخن کے ہوں گے

تھا یہ معلوم کسے دورِ غلامی کے بعد
پھر شب و روز وہی رنج و محن کے ہوں گے

کامیاب آئیں گے اب لوگ کہ ہیں بد کردار
ہوں گے تکلیف میں جو نیک چلن کے ہونگے

اس طرح دادئ غربت میں جو یاد آتے ہیں
شوکتؔ احسان کئی اہلِ وطن کے ہوں گے

زاہد کا خطاب ہو چکا ہے
دل وقفِ عذاب ہو چکا ہے

دَورانِ بہار کھل گیا تھا
پھر قتل گلاب ہو چکا ہے

کچھ قرض ہے دل کا دل پہ ورنہ
باقی تو حساب ہو چکا ہے

سہواً جو لکھا مرے قلم نے
وہ لفظ کتاب ہو چکا ہے

دل عشق سے منحرف نہیں، گو
سو بار خراب ہو چکا ہے

تہمت ہے کہ جی رہے ہیں جب سے
مرحُوم شباب ہو چکا ہے

شوکتؔ ہے خیال میں بدستور
وہ وقت جو خواب ہو چکا ہے

○

صلیب اس لیے یوں دوش پر اُٹھا کے چلے
کہ تیرے شہر میں ہم لوگ سر اُٹھا کے چلے

وہ دور آیا کہ ہر کوتوال چور کے ساتھ
چراغ ہاتھ میں اب رات بھر اُٹھا کے چلے

ہنر نہ بیچ یہ بازارِ اہلِ قدر نہیں
تمام فائدے یاں بے ہنر اُٹھا کے چلے

ہم آج اگر نہیں منزل پہ کل پہنچ جائیں
قدم تو ساتھ مرا ہم سفر اُٹھا کے چلے

نہیں مضائقہ جھک جائے راہِ شوق میں سر
مگر یہ شرط ہے رہروِ نظر اُٹھا کے چلے

ذرا سنو تو مرے ہم صفیرِ خوش موسم
چمن سے اب یہ نشیمن کدھر اُٹھا کے چلے

دکاں لگی ہی تھی شوکتؔ کہ ہم بڑھا کے اُٹھے
بسا بھی ٹھیک نہیں تھا کہ گھر اُٹھا کے چلے

ہمارا طائرِ دل کب ہمارے بس میں ہے
رہائی میں اسے تکلیف، خوش قفس میں ہے

بڑھوں اگر تو کسی تک مری رسائی نہ ہو
رُکوں تو یوں لگے وہ میری دسترس میں ہے

کسے کسے یہ بتاؤں ترے تعلق سے
کچھ امتیاز محبت میں اور ہوس میں ہے

کشاں کشاں ہے روانہ مرا مسافرِ دل
تری لطیف صدا نغمۂ جرس میں ہے

تمام عمر رہا ہے گمان لمحۂ وصل
بس اس برس میں ہے، شاید یہ اس برس میں ہے

مجھے تو دل کے قدم تیرے پاس لے آئے
وگرنہ ذہن بدستور پیش و پس میں ہے

ہے اک حسیں کا عطیہ یہ کیفیت شوکتؔ
جو انگ انگ میں ہے، جو نفس نفس میں ہے

وحشت کے واسطے نئی تدبیر چاہیئے
ان مہوشوں کے پاؤں میں زنجیر چاہیئے

تشریف لائے خواب میں تم روز مہرباں
بارے یہ لُطف صُورتِ تعبیر چاہیئے

ماتھے پہ آدمی کے نمایاں نوشتہ ہو
خود آدمی کے ہاتھ میں تقدیر چاہیئے

اے انقلابِ شام و سحر کے نقیب بس
انسانیت کو وقفۂ تعمیر چاہیئے

جس کو نہیں ہے عزّتِ نفس آپ ہی عزیز
بے شک اس آدمی کی نہ توقیر چاہیئے

شیریں نہ شہرزاد نہ لیلےٰ کی آرزو
اپنے سیال دیس کی اک ہیر چاہیئے

شوکتؔ جمالِ دوست کا محرم ہوا خیال
دیکھیں جنہیں بہار کی تصویر چاہیئے

ساتھ ساتھ اپنے تو دریا کا کنارا جائے گا
کیا خبر لیکن ہمیں کس گھاٹ اتارا جائے گا

سیج کانٹوں کی ملے یا پھول پہلو یار کا
زندگی کو ہر طرح ہنس کر گذارا جائے گا

پھر خلا کی گود سے وہ شب تراشی جائیگی
تیری زلفوں کو تصوّر میں سنوارا جائے گا

تیری بندہ پروری پہ ہے مجھے یہ اعتماد
تو ضرور آئے گا جب تجھ کو پکارا جائے گا

ہم ملیں گے فصلِ گُل میں خوبصورت بار سے
شوکتؔ اس موسم کو اب بڑھ کر نکھارا جائے گا

○

بیت

کچھ تو ہو کرب و بلائے کربلا کا احترام
اہتمامِ تشنگی کیجے سبیلوں کی جگہ

○

جس شے سے ہو خرد کا تدارک وہ ہم سے لے
جو کر سکے ہمارے جنوں کا ازالہ، دے

○

تیرا شوقِ آرائش میری جان اپنا تھا
یاد آئے تھے ہم یا صرف دھیان اپنا تھا

ہے جو اب مرے اندر جاگزیں عدو بن کر
ہاں کبھی وہی اک شخص مہربان اپنا تھا

زیست کی کشاکش میں ماجرا عجب گذرا
کامیاب تم نکلے ، امتحان اپنا تھا

کوئی شخص بے تحقیق اعتماد کے لائق
بے سبب کسی سے دل بدگمان اپنا تھا

اپنے گھر پہ اب ہم دے کے دستکیں ایسے
ہم جسے بلاتے ہیں میہمان اپنا تھا

بن گیا ہے جو معبد، ہے جو اب زیارت گاہ
ہم وہاں فرو کش تھے، وہ مکان اپنا تھا

شوکتؔ اس چمن میں کچھ غیر ہی نہ گُل چیں تھے
یہ ہُوا ہے ویراں جب باغبان اپنا تھا

کہیں بھی جا کے جو رہتے تو ہم کہاں رہتے
وہی زمیں پہ ، وہی زیرِ آسماں رہتے

کوئی جگہ نہ ملی تیرے وہم سے خالی
یہ تیرے دشمنِ آرام سے جہاں رہتے

یہ اور بات کہ خوش آ گئی تری صحبت
ہم اپنے فیضِ طبیعت سے بھی جواں رہتے

سند جو قابلیّت کی ہمیں بہم آتی
مقابلے کے کئی اور امتحاں رہتے

نہ دی زمانے نے مہلت وگرنہ ہم وہ تھے
ہمیشہ اہلِ محبت کے درمیاں رہتے

قبائیں ان سے بنا لی ہیں ناخداؤں نے
سفر بخیر تھا سالم جو بادباں رہتے

پہاڑ راستہ شوکتؔ ضرور دے دیتے
نہ جذب جھرنے جو ہوتے ، رواں دواں رہتے

○

ہر شخص شناخت کھو رہا ہے
اک شخص کا نام ہو رہا ہے

اس ہی کو نہ کاٹنی پڑے پھر
کانٹوں کی جو فصل بو رہا ہے

جاگا ہے تمام عمر شاید
اس چین سے کوئی سو رہا ہے

تھا قابل ذکر بھی نہ قصہ
پھر یاد بھی آپ کو رہا ہے

کیا حال ہمارا پوچھتے ہو
صاحب یہ وہی ہے، جو رہا ہے

سچ مچ کا گدھا اسے نہ سمجھو
جو آدمی بوجھ ڈھو رہا ہے

شوکتؔ کرے پیار ترک شاید
دل جرم اِسے مان تو رہا ہے

(—)

تھا، اب نہیں ادب کو وہ ماحول راس ہے
شوکتؔ ترے بغیر پشاور اداس ہے

شاید بہار پر کوئی گذری ہے واردات
کانٹوں میں آن ہے نہ شگوفوں میں باس ہے

ہے دل کو دل سے راہ محبت میں واقعی
یا ظن ہے، واہمہ ہے، گماں ہے قیاس ہے

ہو سلسبیل، جھیل کہ ساقی تری سبیل
اپنے نصیب میں یہی خالی گلاس ہے

ہم سے ملے بغیر وہ دلچسپ آدمی
کس بے تکلفی سے محیطِ حواس ہے

بازار کیا، ہیں خوف زدہ اب گھروں میں لوگ
کس قسم کا فضا پہ مسلّط ہراس ہے

برداشت کر سلوک جو شوکتؔ ہے تیرے ساتھ
تجھ کو نظر پہ زعم تھا مردم شناس ہے

سوچ تو میرے قریب اصل میں آئی کتنی
اور ھم پر ہُوئی انگشت نمائی کتنی

ایک شخص ایسا ملا پھر نہ رہا اندازہ
زندگی کس قدر اپنی تھی ، پرائی کتنی

ہم نے کی بُجھ کے جو اک بات تو وہ جل اٹھی
رائیگاں ورنہ گئی شعلہ نوائی کتنی

زندگی گذری ہے یاروں سے نبھانے ساری
حاصل اس میں ہوا کتنا یہ گنوائی کتنی

آپ نے مجھ سے سُنا میرا فسانہ کتنا
اور خود میں نے کہانی یہ سنائی کتنی

ہسپتالوں میں مہیّا تھی بکثرت لیکن
دی گئی مفت مریضوں کو دوائی کتنی

وہ نہیں مانتے اس دل کو خبر ہے شوکتؔ
ہم نے اس شہر کے لوگوں سے نبھائی کتنی

پھر محبت کی کسی سے پھر پریشانی ہوئی
برف شعلہ سی لگی ہے، آگ برفانی ہوئی

بارہا پھر کھینچ لایا ہے اسی کے پاس دل
بارہا جس شخص سے مل کر پشیمانی ہوئی

صرف مست آنکھیں کبھی تھیں کیفیت آور بہت
اب یہ حالت ہے ہمیں مے بے مزہ پانی ہوئی

باخبر ہے، گر توجہ میں ہے یوں محتاط حسن
کم ہوئی ہے قدر جس شے کی فراوانی ہوئی

کاروانِ شب کی ساری مشعلیں مدھم پڑیں
گردو پیش ایسی تمہارے رُخ سے تابانی ہوئی

ہم اُٹھا لاتے ہیں سب فصلِ وفا بازار میں
خوبصورت گاہکو ہم سے یہ نادانی ہوئی

فکر وابستہ ہوا شوکتؔ کسی کی ذات سے
جب کوئی آیا ہے تقریبِ غزل خوانی ہوئی

○

نہ ساتھ خوش تھا، بچھڑ کے وہ کچھ اداس تو ہے
اس اعتبار سے دردِ فراق راس تو ہے

اثر پذیر بھی ہو گر نہیں ہے یہ مقدور
مری بساط میں اک عرض التماس تو ہے

یہ شہر چھوڑ کے جانے کو جی نہیں کرتا
وہ میرے پاس نہیں، میرے آس پاس تو ہے

بظاہر اس کے تر و تازہ ہونٹ جو بھی کہیں
بجھا نہ پائے جو پانی، اُنہیں وہ پیاس تو ہے

گیا زمانہ کبھی لوٹ کر نہیں آتا
مگر وہ شخص زمانہ نہیں، کچھ آس تو ہے

کسی سے طے نہ ہُوا کیوں معاملہ دل کا
مزاج داں نہ سہی یہ اداشناس تو ہے

بد احتیاط نہیں تیرے ذکر میں شوکتؔ
ترے بغیر اگرچہ یہ بدحواس تو ہے

آئے ہیں آپ اور یہ لگتا ہے خواب سا
ورنہ سکوں کے ساتھ ہو کیوں اضطراب سا

نیلم سی آنکھ، کانچ سا ماتھا، گہر سے دانت
پھر بھی مہک رہا ہے وہ تازہ گلاب سا

محسوس ہو رہا ہے مرے ساتھ ساتھ ہے
وہ ہم عنان و ہم سفر و ہم رکاب سا

اے خوش خیال اپنے حوالے سے غور کر
مضمر مرے سوال میں ہے کچھ جواب سا

یہ کیا ضرور دل کی عبارت پڑھا کرو
چہرہ کھُلا ہُوا ہے ہمارا کتاب سا

اب تک ذرا بھی اس میں نہ ترمیم ہو سکی
ملنا ترا عذاب، نہ ملنا عذاب سا

شوکتؔ اسی طرح کسی مہ وش سے رابطہ
وہ ہی پسِ شباب ہے عالم شباب سا

○

دخل ہو جب عمل میں نیّت کا
مسئلہ پھر نہیں مشیّت کا

ذہن سے منحرف ہوا ہے دل
کیا کہوں ماجرا اذیّت کا

حکم بردارِ بندہ، بندہ ہو
یہ تصوّر ہے حاکمیّت کا

دوش پر آدمی اُٹھائے پھرے
اَب جنازہ خود آدمیّت کا

زن کو ہو گوہرِ حیا کا پاس
مرد کو جوہرِ حمیّت کا

حُسن کی معرفت ہوا افشا
عشق پر راز سرمدیّت کا

دی تسلّی کسی نے یوں شوکتؔ
چین جاتا رہا طبیعت کا

○

پھُول سے ڈھلکا ہوا اوس کا قطرہ ہوں مَیں
شاخ سے ٹوٹ کے گرتا ہوا پتّہ ہوں مَیں

چھوڑ کے چل دیا ہے جیسے بدن ہی مجھ کو
جس کی پہچان نہیں کوئی وہ سایہ ہوں مَیں

جو کہ در آیا تھا روزن سے کرن کے ہمراہ
تیرے کمرے میں وہ بے فائدہ ذرّہ ہوں مَیں

وادی و کوہ و بیاباں سے گذر کر آخر
شہر میں آ کے جو کھو جائے وہ رستہ ہوں مَیں

اپنی آنکھوں سے نظر ہی نہیں آتا مجھ کو
اپنے چہرے کے لیے آپ ہی پردہ ہوں مَیں

بُوجھ کے اور ادق ہو وہ مُعمّہ ہے تو
کھُل کے جو اور اُلجھ جائے وہ عقدہ ہوں مَیں

خود اُجڑ کر کیا ہے میں نے کسی کو آباد
نقش میں ڈھل کے جو مٹ جائے وہ جذبہ ہوں میں

مُدّعی ہے کہ مکمل کروں تسلیم اسے
کل جو کہتا تھا تری ذات کا حصّہ ہوں میں

شوکتؔ اس سینے میں محسوس نہیں اب وہ بھی
دل کے باعث کبھی دعویٰ تھا کہ زندہ ہوں میں

ابیات

قابلِ دار نہیں جوہرِ جُرأت منداں
قابلِ داد ہیں جو جُرم سرِ عام ہوئے

چند کرنوں کے طلب گار ہیں سائے کی طرح
ہنس کے جو ہم سے مِلا بندہ بے دام ہوئے

○

جس قدر اپنے تھے رفتہ رفتہ بیگانے ہُوئے
اجنبی لگتے ہیں چہرے جانے پہچانے ہوئے

زخم سب آہستہ آہستہ ہُوئے ہیں مندمل
واقعاتِ تلخ بھی دلچسپ افسانے ہُوئے

ہر کوئی بیزار ہو کر گھر سے ہجرت کر گیا
شہر ویراں ہو گئے، آباد ویرانے ہُوئے

مانگتا ہے شوق پھر پہلی سی بزم آرائیاں
شمع پر بھی جمع اب دو چار پروانے ہُوئے

حیرت آتی ہے ہمارے واسطے بھی باغ میں
اوس صہبا بن گئی ہے پھول پیمانے ہُوئے

سنگساری کے لیے معصومیت کی شرط پر
رہ گئے سب لوگ پتھر ہاتھ میں تانے ہُوئے

جب ہُوئی بخشش دولت مند مجرم پر ہُوئی
جب ہُوئے نادار معصوموں پہ جُرمانے ہُوئے

کوئی بھی تشریف لائے عادتاً اس پر ہمیں
کچھ سہی جذبات لیکن پھُول برسانے ہُوئے

اب غلط رو ہوں تو نکتہ چیں نہ کوئی معترض
ہیں ہوا ہشیار شوکتؔ لوگ دیوانے ہُوئے

قطعہ

بسکہ ہے حال کی دہلیز عجب دوطرفہ
میں سرِ راہ گذر ہوں کہ سرِ منزل ہوں

گھر یہ کہتا ہے ٹھہر جا ترا ماضی ہوں نہیں
راہ کہتی ہے کہ چل مَیں ترا مستقبل ہوں

ہم سرشتِ قدسیاں تخلیقِ انسانی نہیں
اس لیے مجھ کو گناہوں پر پشیمانی نہیں

یہ بدن ہیں یا اُگے ہیں پتھروں میں خال و خد
اس پہ حیرت ہے کہ جیتے ہیں، گراں جانی نہیں

مان لیتے ہیں کہ چربہ ہے کہیں کا یہ جہاں
لیکن انساں یہ کسی کا مظہرِ ثانی نہیں

بے نیازانہ گذرتے ہیں حسینوں کے ہجوم
میں سمندر میں ہوں پینے کو مگر پانی نہیں

شوق سے کرتے رہو ماخوذِ ناکردہ گناہ
منصفوں کے سامنے پیشی ہے، نگرانی نہیں

آدمی نے قحط برپا کر دیا بن کر خدا
ورنہ اس دنیا میں کس شے کی فراوانی نہیں

شاعری کو شوکتؔ اک صاحب کی بھی تحریک ہے
کارگر اپنی طبیعت ہی کی جولانی نہیں

کون کہتا ہے اسے شہر کا اندیشہ ہے
قاضیٔ شہر نقب کوشی کا ہم پیشہ ہے

خانقاہوں سے محلّاتِ شہی تک ماحول
آدمی کے لیے اِک کارگہِ بیشہ ہے

کوہکن ضرب لگا اس سے ستونِ شہ پر
بے ستوں کے لیے بے فائدہ یہ تیشہ ہے

چُوم کے پڑھتا ہوں میں قتل کے پروانے کو
دوست کی سمت سے آیا ہُوا اندیشہ ہے

آدمی ٹوٹ گیا ہے مرے اندر شوکت
جسم اب صرف سراپائے رگ و ریشہ ہے

ابیات

آدمی نے آدمی کو زندگی ترکہ میں دی
آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہیئے

ہے یہ کس کا تذکرہ خود فیصلہ کر لیں گے لوگ
سارے کردار وں کا لیکن نام آنا چاہیئے

بوتل سے مے ہی چھلکی ہے جب کاک کھُل گیا
انسان کی سرشت نہیں پاک، کھُل گیا

دل بند ہو گیا ہے اچانک اگر کبھی
کچھ دیر کو دریچۂ ادراک کھُل گیا

لے کر صبوحیاں چلے آئے ہیں مے فروش
ہو کر ہرا جو زخمِ رگِ تاک کھُل گیا

ہمت کا تھا معاملہ، جرأت کی بات تھی
سارا جہان تا حدِ افلاک کھُل گیا

بہتات خوب شہر میں سانپوں کی جب ہُوئی
تب ایک آدھ مرکزِ تریاک کھُل گیا

شوریدگی بہار سے کچھ اور بڑھ گئی
کچھ اور گل کا پیرہنِ چاک کھُل گیا

شوکتؔ ہُوا ہے ہم پہ روا شغلِ سرخوشی
خود وہ متین ہو گیا بے باک کھُل گیا

○

دوات و کلک کا تم قحط ڈالو، حل یہ ہم کر لیں
لہو کو روشنائی، انگلیاں اپنی قلم کر لیں

کبھی اس کج ادا سے دل بغاوت پر ہے آمادہ
کبھی یہ جی میں آتا ہے سرِ تسلیم خم کر لیں

طبیعت خوگرِ تکلیف کر دی ہے زمانے نے
نہیں کچھ فرق پڑتا آپ بھی ہم پر ستم کر لیں

محبت اے حسیں تاجر اگر جنسِ تجارت ہو
یقیناً ہم بھی اس کے نرخ میں بسیار و کم کر لیں

کسی سقراط کی باتوں کی بو ماحول سے آئی
اٹھو پھر بہرِ قتلِ آگہی تیار سم کر لیں

اگر نقشہ وہاں کا حافظے میں تازہ ہو جائے
تو پھر مشکل نہیں ہے اس زمیں کو ہم ارم کر لیں

طوافِ دل کیا ہے ذات کے معبد میں اے شوکتؔ
چلو تبدیلیٔ ماحول کو سیرِ حرم کر لیں

مذاقِ زیست کی محتاط پرورش نہ رہی
بدن بجا نہ رہا رُوح مرتعش نہ رہی

رہا نہ حسنِ فسوں گر کا شیوہ شائستہ
متین پیشہ ورِ عشق کی روش نہ رہی

شراب سرد پڑی گرم ہو گیا پانی
کہ پیاس کتنی بجھائی زبان تشنہ رہی

اذان کے ہیں بدستور پُر اثر الفاظ
مگر صدائے مؤذن ہی پر کشش نہ رہی

اُٹھی ہے آبلہ پائی کی رسم یوں شوکتؔ
کہ نوکِ خار میں بھی لذّتِ خلش نہ رہی

ابیات

نیند بھی بندگی ہے، آ سوئیں
اے وظیفہ گذارِ نیم شبی

جی کھول کے آج ہم بھی رولیں
برسات کی آخری جھڑی ہے

نظر نواز وہ پہلی سی ہستیاں نہ رہیں
روا ہمارے لیے بُت پرستیاں نہ رہیں

فضا ہی وہ نہیں دیہات اور شہروں کی
بسائی تھیں جو کبھی اب وہ بستیاں نہ رہیں

تری نگاہ سے پینے کی آرزو کی تھی
پھر اس کے بعد شرابوں میں مستیاں نہ رہیں

یہ اور بات ترا دل نہ ہو سکا شاداب
وگرنہ آنکھیں مری کب برستیاں نہ رہیں

وہی ہے بھاؤ ٹکے سیر دُکھ کی منڈی میں
اگرچہ خاک سی چیزیں بھی سستیاں نہ رہیں

تمام ہو گئے سارے سماج کے بندھن
وہ رکھ رکھاؤ گیا، گھر گرہستیاں نہ رہیں

موازنے کا ہے سارا معاملہ شوکتؔ
بلندیاں نہ رہیں جب، تو پستیاں نہ رہیں

○

میں نہیں کہتا کہ الہام اُتار آیہ لکھ
فن میں لیکن نہ خیالاتِ فرو مایہ لکھ

رات نے بطن سے پھولوں کو پلائی ہے اوس
کہہ نہ ڈائن، اسے فطرت کی حسیں دایہ لکھ

منطق و فلسفہ و حکمت و قانون و ادب
کوئی بھی درس محبت کا نہ ہم پایہ لکھ

کندہ کر سنگ پہ، کر صفحۂ کاغذ پہ رقم
بلکہ ہر دل پہ زبوں کاریٔ سرمایہ لکھ

شیخ کو کعبہ کی دیوار میں چُن دے پہلے
پھر خداوند کا بے شک اسے ہمسایہ لکھ

رُوح کے ناتے نہ انساں کو فرشتہ ٹھہرا
ہاتھ اور پاؤں کی نسبت سے نہ چوپایہ لکھ

ہر عبارت کا ہے اسلوب الگ بیشک پڑھ
تجھ سے جو خاص معنون ہے وہ پیرایہ لکھ

سلکِ تحریر کا ہر لفظ تھا اک دردانہ
تو مجھے پھر وہی مکتُوبِ گراں مایہ لکھ

شوکتؔ اک شخص فرد کش کہ دل و ذہن میں ہے
تو بہت کچھ بھی کہے گر تو اسے سایہ لکھ

ابیات

عمر بھر دل میں کوئی شخص رہا ہے شوکت
عمر بھر اس سے میسّر نہ ملاقات ہُوئی

کیوں لذّت انتظار کی جائے تمہارے ساتھ
دل کو رہے یہ وہم کہ تم لوٹ آؤ گے

بیمار نہیں، دل پہ نہ رکھ ہاتھ نہ سر باندھ
اے مضمحل حوصلہ اُٹھ اور کمر باندھ

سب خیمے لپیٹے گئے، سب کس لیے محمل
تو بھی ہے اسی قافلے میں رختِ سفر باندھ

تُو نے جو کتر ڈالے تھے وہ پھر نکل آئے
فطرت کی ہے توہین، کبوتر کے نہ پر باندھ

جادو کو نہ توفیق ہوئی ہے نہ کبھی ہو
جس طرح نظر سے کوئی دیتا ہے نظر باندھ

ہر اک کو پرکھنی ہے زمانے کی کسوٹی
تُو خُود نہ ہوائے ادب و علم و ہنر باندھ

جگنو بھی کئی رات کے دھوکے میں گئے گندھ
ہر زلف کو پھر کھول کے (کچھ عذر نہ کر) باندھ

شوکتؔ دیا پیمانِ وفا یار نے جھٹ توڑ
کہتا تھا کہ رکھے گا اسے زندگی بھر باندھ

ہے یہ قید آزاد ہو کر دامِ استبداد سے
آشیاں بندی کریں ہم مرضئ صیاد سے

تنگ ہوتی جا رہی ہے آدمی پہ کائنات
گو کشادہ کر رہا ہے زیت نئی ایجاد سے

اہرمن نے کی ہے صف مضبوط یزداں کیخلاف
اب محاذ اس نے بنایا مل کے آدم زاد سے

مسئلہ محنت کے بدلے طے شُدہ اُجرت کا تھا
روک لی شیریں یہ حیلہ شاہ نے فرہاد سے

خونِ دل کی روشنائی سے سرِ انگشتِ قلم
لکھ کر املائے جنوں پائے سند استاد سے

میرؔ و غالبؔ کے تعلق دار ہم اُردو سے ہیں
آشنا اس کی بدولت حالیؔ و آزادؔ سے

ہم نے شوکتؔ عام پیرائے میں یوں تحریر کی
لطف لیں اپنی سمجھ کر سب مری روداد سے

جنونِ بے سر و ساماں بڑے شکیب میں ہے
کہ تار اب کوئی دامن میں ہے نہ جیب میں ہے

مُعاشرہ ہے یہ قائم بہ وصفِ نادانی
ہر ایک شخص کسی شخص کے فریب میں ہے

بلندیوں پہ چڑھا ہے زور سے پانی
کیا نہ دھیان کہ بستی بھی اک نشیب میں ہے

خراب جب سے ہُوئی باغبان کی نیّت
شمیم و ذائقہ کم کم گلاب و سیب میں ہے

جمالِ ذات رہینِ تکلّفات نہیں
یہ کم نما ہے جو پوشاکِ دیدہ زیب میں ہے

جو درک سینہ بہ سینہ ملا ہے مستوں کو
رقم نہیں وہ کسی کتبہ و کتیب میں ہے

ہے دلگداز محبّت کا عارضہ شوکتؔ
کہ مبتلا کوئی اک شوقِ دلفریب میں ہے

کیا ملا شاعری میں نام برآوردی سے
دل ہی رسوا ہوا جذبات کی بے پردی سے

غیر کے ساتھ ترے واقعۂ قرب کا کرب
دلِ اندوہ زدہ سہہ گیا بے دردی سے

اب کہاں لوگ کہ باوصفِ شکستہ پائی
سفرِ عشق پہ قائم رہیں پامردی سے

ہم ترے کوچے سے پہنچے نہ ترے کوچے تک
عمر بھر کام بھی رکھا ہے جہاں گردی سے

دل میں پڑتی ہے تری گرم نظر سے ٹھنڈک
ورنہ گرمی کا کچھ اس پر نہ اثر سردی سے

وہ جو چہرے پہ ہے اک ہجر زدہ لڑکی کے
سُرخیٔ عارضِ گُل ماند ہے اس زردی سے

جذبۂ عشق کہاں ہے متحمل شوکتؔ
اسے مجروح زمانہ کرے ہمدردی سے

ہے تری ذات کی مانند ہمیشہ تازہ
یہ غمِ دل کہ ترے عشق کا ہے خمیازہ

کم نہیں لفظِ طلسمات سے اس پاؤں کی چاپ
کھُل گیا مرے بدن زار کا دل دروازہ

جشن کے واسطے سب جمع ہُوئے دُشمن دوست
کس کی رخصت کا ترے شہر میں ہے آوازہ

ہے پریشان ادھر میری جمیعِ خاطر
منتشر ہے تری زلفوں کا ادھر شیرازہ

اشکِ خونیں سے نکھر جاتا ہے میرا چہرہ
آبِ زنگار رُخِ آئینہ کو ہے غازہ

کس قدر بادہ سے ہوتی ہے نشے کی توہین
پی کہ اس آنکھ سے ہوگا یہ تجھے اندازہ

شوکتؔ اک گُل بدن ایسا ہے بہار افزائش
عمر بھر جس نے رکھے میرے دل و جاں تازہ

جبیں جو خم سرِ دہلیزِ خواجگی ہوگی
خدا کے حق میں یہ تردیدِ بندگی ہوگی

رہا کیا ہے اسیروں کو شکریہ، لیکن
ملیں گے آپ سے ہم پھر جو زندگی ہوگی

اُنہیں پیالے میں بھر کر لہو ہمارا دو
فرو نہ مے سے وڈیروں کی تشنگی ہوگی

لگا کے آگ مرے جھونپڑے کو مت خوش ہو
اگر یہ پھیل گئی تیرے گھر لگی ہوگی

خُدا نے کاشت کی انسانیت جو مٹی میں
کہا فرشتوں نے پیدا درندگی ہوگی

خزاں بزور فروکش ضرور ہو جائے
چمن رہا تو یہاں پھر شگفتگی ہوگی

ہیں بد معاملہ جن سے ہے سابقہ شوکتؔ
ہمارے حق میں بُری، کارکردگی ہوگی

منکرِ آدمی و قائلِ یزداں ہونا
باور آیا ہے ہمیں شیخ کا شیطاں ہونا

ساکنانِ اِرم آ کے ملتے فراواں ہم سے
مشکل اتنا نہیں ہوتا اگر انساں ہونا

چاہیئے آدمی کو ہمّت دشوار پسند
بسکہ آسان ہے ہر کام کا آساں ہونا

ہائے یہ پھُول کی تقدیر شگفتہ ہو کر
چند ساعت کے لیے زینتِ گلداں ہونا

بحر میں ڈھونڈتی پھرتی ہے وجُود اب اپنا
بوند کو راس نہ تھا ھمدمِ طوفاں ہونا

شب میں آہستگی سے ایک دریچہ کھلنا
اس میں دو منتظر آنکھوں سے چراغاں ہونا

نفسیاتی ہے کہ شوکت یہ اُپج نفسانی
ذوق مانگے ہے جو ہر چیز کا عریاں ہونا

اس طرف خاص ترا دھیان نہیں ہے ایسا
ورنہ تُو پیار سے انجان نہیں ہے ایسا

کی محبت کے عوض تو نے محبت ہم سے
ہے یہ احسان، پہ احسان نہیں ہے ایسا

مشکل آتی ہے بہت عشق میں آخر آخر
اول اول بھی یہ آسان نہیں ہے ایسا

دل سدا خوش رکھے معشوق نہیں ہے ایسی
پھُول تازہ رہیں، گلدان نہیں ہے ایسا

یہ عجب مرحلۂ عشق ہے، دل تیرے بغیر
گو پریشاں ہے، پریشان نہیں ہے ایسا

دیکھ کر ہو جسے اب موسمِ گُل کی توثیق
کوئی بھی چاک گریبان نہیں ہے ایسا

شاید اس شخص سے مل جائے طبیعت شوکتؔ
گو بظاہر کوئی امکان نہیں ہے ایسا

گمرہی میں تو سفرِ زیست کا آسان ہُوا
نیکیاں کر کے بدی پر مرا ایمان ہُوا

تیری فردوس میں محبوس فرشتوں کی طرح
رہ کے کچھ روز بہت تنگ بھی انسان ہُوا

رُوح کی کوششِ دریافت میں پامال ہے جسم
ہوسِ فائدہ میں اَور یہ نقصان ہُوا

خوگرِ مشقِ ستم میرے جفا جو نے مجھے
روکا منّت سے جُدائی کا جو امکان ہُوا

شہر میں اس قدر افزائشِ شور و شر ہے
ہر گلی کوچہ گذر حشر کا میدان ہُوا

نیّتِ بد نے جُھلس ڈالا ہر امکانِ نمو
پھل نہ انبار بنا، بیج نہ کھلیان ہُوا

ایک کم ظرف کو کیوں دوست کیا تھا شوکت
ٹھیک ہی وہ تری رسُوائی کا سامان ہُوا

بمشکل اپنے قدم جب سنبھلنے لگتے ہیں
وہ لڑکھڑاتے ہُوئے ساتھ چلنے لگتے ہیں

وہ ساتھ ہو تو مرا دل دھڑکنے لگتا ہے
نہ ہو تو سینے میں ارماں مچلنے لگتے ہیں

تمہارے دل میں بھی جذبات راہ پالیں گے
کہ پتھروں میں بھی چشمے اُبلنے لگتے ہیں

کبھی تو ساتھ مرے دیکھ کر تمہیں خوش ہوں
کبھی یہی مرے احباب جلنے لگتے ہیں

وہ شخص یاد بڑی شورشوں سے آتا ہے
کبھی جو بھول کہ اس کو بہلنے لگتے ہیں

یہ مرحلہ بڑا نازک ہے دوستداری کا
ذرا سی بات پہ آنسو نکلنے لگتے ہیں

ہے دیدنی وہ سماں، رنگ کتنے چہروں کے
ہماری بات پہ شوکت بدلنے لگتے ہیں

○

گلاب ہم وہ گلستاں سے چیدہ لائے ہیں
سب اپنے حسنِ نظر پر عقیدہ لائے ہیں

کمینِ ذوق سے فتراکِ پہلوئے دل میں
ہم ایک آہوئے وحشت رمیدہ لائے ہیں

وہ شہر جس میں ہر اک مدعی خلوص کا تھا
وہاں سے ہم دلِ مردم گزیدہ لائے ہیں

وہ لالٹین انہی کے لیے تھی اندھے کی
دلیل جس کے خلاف اہلِ دیدہ لائے ہیں

سنے گی ایک زلیخا کی اک عدالت پھر
پھر ایک یوسفِ دامن دریدہ لائے ہیں

یہ اپنی مدح میں سمجھے ہر اک پری چہرہ
ہم اپنے یار کا لکھ کر قصیدہ لائے ہیں

ہوتے ہیں دید پہ کیا لوگ مضطرب شوکتؔ
ہم اک حسیں کی حدیثِ شنیدہ لائے ہیں

اک اک قدم پہ راندۂ دنیا ہوا ہوں مَیں
یہ بھی بُرا ہُوا ہے کہ اچھا ہوا ہوں مَیں

تُجھ کو سپردِ غیر کیا خوش دلی کے ساتھ
یہ اور بات پھر بڑا تنہا ہوا ہوں مَیں

کردار کا معائنہ کرتے ہیں لوگ روز
ہر چند ساری عمر کا دیکھا ہوا ہوں مَیں

طے کر دیا ہے تیری نظر نے معاملہ
جب بادۂ طہور کا تشنہ ہوا ہوں مَیں

پہلو نشین آکے ہوا ہے وہ خاص شخص
پھر کس کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں مَیں

دشمن کسی محاذ پہ کب زیر کر سکا
اے دوست تیرے سامنے پسپا ہوا ہوں مَیں

شوکتؔ اس ایک شخص کی ہے جستجو مجھے
طعنہ حسین دیتے ہیں جس کا ہوا ہوں مَیں

کھلتی گئی اک ایک گرہ نفسیات کی
جُوں جُوں غزل میں تیرے حوالے سے بات کی

دل نے کیا خلوص سے اس بے وفا کو پیار
دل نے ہمارے ساتھ بڑی واردات کی

اتنی ہی اور بڑھ گئی باہم مغائرت
جتنی نظر زیادہ ہوئی التفات کی

معلوم ہو سکا نہ کہاں زندگی ملی
جوڑی بہت کڑی سے کڑی واقعات کی

مذہب کا صرف نام ہے، ورنہ سماج پہ
اب تک ہے مہر ثبت وہی ذات پات کی

سچ کیا لکھیں کہ ٹوٹ گئے سب قلم ندیم
سب روشنائی سوکھ چکی ہے دوات کی

اک شخص ساتھ لے گیا شوکت شعور وقت
اب تو تمیز دن کی رہی ہے نہ رات کی

کیسے گذر رہے ہیں یہ دن رات کیا کہیں
تُجھ سے چھُپے ہُوئے نہیں حالات کیا کہیں

سب چشمہ ہائے چشم ہیں پھُوٹ پھُوٹ کے
جس طرح اب کے برسی ہے برسات کیا کہیں

کیا حادثہ تھا ہجرِ رفیقاں بتائیں کیا
کیا سانحہ تھا ان سے ملاقات کیا کہیں

تم جان لو حبیب جو محسوس کر سکو
کہنے کی بھی نہیں ہے ہر اک بات کیا کہیں

رہزن سے بچ کے نکلے تو وہ آشنا ملا
کیسی مگر لگائے ہُوئے گھات کیا کہیں

اپنا سا ہو جو مدِ مقابل تو بات ہو
تجھ سے ہم اے عدُوئے کم اوقات کیا کہیں

شوکتؔ ادب کے نام پر مقبُول عام ہے
کس کس طرح کا لغو و خرافات، کیا کہیں

تھا وقت کرب کا کہ طرب کا گذر گیا
گذرا ہے جس طرح بھی یہ، سب کا گذر گیا

ہم دورِ عافیت کے ابھی تک ہیں منتظر
وہ دورِ عافیت کہ جو کب کا گذر گیا

خوش فہم لوگ صبح بخیر اس طرح کہیں
جیسے زمانہ واقعی شب کا گذر گیا

تہ کرکے طاقِ نسیاں میں شجرے سجائیے
اب عہدِ فخرِ حسب و نسب کا گذر گیا

آموختگی نے اور طرح اب جنم لیا
جو علم تھا رہینِ کُتب کا، گذر گیا

بے رنگ روپ جیسے ہُوئے اب سدا نہ تھے
ہم پہ بھی اک زمانہ غضب کا گذر گیا

باقی کہاں ہیں صحبتیں ذوقِ سلیم کی
شوکت ثقہ سلیقہ ادب کا گذر گیا

ضو میں اس کی یہ حقیقت پڑھی تفصیل کے ساتھ
ہیں اندھیرے بھی معلق اسی قندیل کے ساتھ

عزم کرتا ہے تلاطم کو ہمیشہ پابند
معجزہ ختم نہیں ہو گیا یہ نیل کے ساتھ

قافلہ دل کا رکا ایک نکو چہر کے پاس
ختم ہوتا نہیں گو راستہ ہر میل کے ساتھ

رل کے بھی وہ مرا مقصودِ محبت نہ ملا
ایک یہ کام مکمل نہیں تکمیل کے ساتھ

چاہیئے دوستو شانے پہ صلیب آرائی
گر عقیدت ہے تمہیں واقعی انجیل کے ساتھ

اس غرض سے تمہیں دریاؤں پہ چلنا ہوگا
بحر تک تم نہیں پہنچو گے رواں جھیل کے ساتھ

ضد ہے اک شوخ کو شوکتؔ کہ ہر اک قصۂ عشق
بِن حقیقت میں سناؤں اسے تمثیل کے ساتھ

○

وہ یکسر دل سے کب جاتی رہی ہے
محبت ہے، طلب جاتی رہی ہے

وہی ہے روز و شب کی آمد و شد
بہارِ روز و شب جاتی رہی ہے

چھپا کے دل پہ دل رکھی محبت
مگر یہ لب پہ لب جاتی رہی ہے

جو اپنے دم سے تھی یا تیرے دم سے
وہ رونق سب کی سب جاتی رہی ہے

کہو ہم سے محبت ہی نہیں تھی
بتاؤ یا کہ اب جاتی رہی ہے

ہوئی تھی بے غرض جو آشنائی
وہ اب یوں بے سبب جاتی رہی ہے

تھی شوکتؔ کی شگفتہ گوئی تجھ سے
یہ اب جانِ ادب جاتی رہی ہے

○

ہوس جو حُسن کو ہوتی نہ خُود نمائی کی
کوئی سبیل نہ بنتی غزل سرائی کی

گناہ تو بشریت کا اقتضا ہے شیخ
بجا ہے گر لگے تہمت نہ پارسائی کی

امیرِ وقت دساور میں کوڑیوں کے مول
وطن کو بیچ کے خوش ہے، بڑی کمائی کی

سلوک اس کا نہ دہراؤں ہمصفیروں میں
رکھی ہے شرط یہ صیاد نے رہائی کی

اگرچہ اہلِ عدالت نے کی نہ داد رسی
بیک زبان مگر داد دی دہائی کی

پڑاؤ ساتھیو کم ہمتّی کا منطق ہے
ہے منزل ایک علامت شکستہ پائی کی

قلم کو اہلِ قلم روسیہ کریں شوکتؔ
لکھے نہ روشنی تو ہجو روشنائی کی

سو تمہاری محفل میں لن ترانیاں بھی ہیں
تم اگر ہمیں دیکھو بے زبانیاں بھی ہیں

تذکرے جفاؤں کے ناسپاس دہرائیں
ورنہ آپ کی ان پر مہربانیاں بھی ہیں

میں نہیں تو کوئی اور بے گیا تمہیں صاحب
نامرادیاں بھی ہیں، کامرانیاں بھی ہیں

ہر کسی سے یوں مت مل میرے بے تکلف دوست
آدمی کی فطرت میں بدگمانیاں بھی ہیں

لمس کا بھی ہلکا سا ہے لبوں پہ کچھ احساس
اور داغ سی دل پر کچھ نشانیاں بھی ہیں

مسکراہٹوں میں ہے آنسوؤں کا نم شامل
زمزمہ نوائی میں نوحہ خوانیاں بھی ہیں

شوکتؔ اس کی باتوں کا نم سدا کرو چرچا
اور کہنے سننے کو سو کہانیاں بھی ہیں

معشوق دمے سے منع جو کرتے ہیں یار لوگ
کیا ہم سے چاہتے ہیں یہ پرہیزگار لوگ

جب نفع دوستی کی تجارت میں کم ہوا
تو دشمنی کا کرنے لگے کاروبار لوگ

تہمت لگا کے میرے مقدر کو بچ گئے
میرے خراب حال کے یہ ذمہ دار لوگ

جیسے خدا کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں
ہم سے کریں سلوک وہ، با اختیار لوگ

نفرت سے سنگسار کیا تھا جسے ابھی
تعمیر کر رہے ہیں اسی کا مزار لوگ

کر مت خرد کی بات پلائیں گے لوگ زہر
کہہ مت جنوں کا حال چڑھائیں گے دار لوگ

شوکتؔ بزور شہر بدر کر رہے ہیں یہ
پھر مدتوں کریں گے مرا انتظار لوگ

حاکموں سے معاملہ ہو گا
منصفانہ نہ فیصلہ ہو گا

تم نے چھُپ کر محاذ کھولا ہے
تم سے کھُل کر مقابلہ ہو گا

زندگی زیب اسی کو دیتی ہے
جس میں مرنے کا حوصلہ ہو گا

کیا خبر تھی کہ جاں نثاروں سے
آپ کو اس قدر گلہ ہو گا

کی وفا ہم نے زود رنج رفیق
جان کر بھی کہ حوصلہ ہو گا

پھر کہیں بھونکنے لگے کُتّے
پھر رواں کوئی قافلہ ہو گا

ایک چوٹی کہ و گے سر شوکت
پھر پہاڑوں کا سلسلہ ہو گا

نغمہ زن جس نے کیا تھا اس قدر چاہوں کے ساتھ
کہ گیا ہر بول ہم آہنگ اب آہوں کے ساتھ

جس طرح لینے نہ دیں گے دم سرِ منزل ہمیں
یُوں لپٹ کہ رہ گئے ہیں پاؤں ان راہوں کیساتھ

جھونپڑی ایوانِ شہ کی زد میں آکر بچ گئی
ضم ہُوئے ہمسائے کے دالان درگاہوں کے ساتھ

واعظوں، شیخوں، خطیبوں کی رہیں ہم رائیاں
سربراہوں، کج کلاہوں اور شہنشاہوں کے ساتھ

ہم شکستہ انگلیوں میں یوں قلم تھامے رہے
جس طرح غازی علم ٹوٹی ہُوئی باہوں کے ساتھ

کیا تری دانست میں اے چارہ گر یہ دل کے زخم
مندمل ہو جائیں گے ان مرہموں پھاہوں کے ساتھ

زندۂ جاوید شوکتؔ کر دیا ملفوظ میں
ہم نے بدخواہوں کو بھی اپنے بہی خواہوں کے ساتھ

دل ہے کیوں ویران دل میں تیرا گھر ہوتے ہُوئے
کیوں نظر آتا نہیں ہے تو نظر ہوتے ہُوئے

زندگی بھر شہر میں ہمسائیگی کے باوجود
کیوں تامل ہو رہا ہے ہمسفر ہوتے ہُوئے

وہ جسے محبُوب ہونے کا گماں خود پر ہُوا
دور تر ہوتا گیا ، نزدیک تر ہوتے ہُوئے

ہے بلا کا خوف بے جا درمیاں ہے رات اگر
ہائے دیکھوں گا کبھی لیکن سحر ہوتے ہُوئے

مسٔلہ یہ ہے جگائیں جاگتے کو کس طرح
بے خبر کیسے بنے تُم باخبر ہوتے ہُوئے

کس قدر آرام سے بے خانماں رہتے تھے ہم
اَب نہیں محفوظ چھت دیوار در ہوتے ہُوئے

شوکتؔ اس صیاد سے ہے طائرِ دل کا سابقہ
جو نہ دے ان کو رہائی بال و پر ہوتے ہُوئے

یا تو دم بھر کو ہستی کا کھیل حبابوں میں دیکھا ہے
یا پانی کی صُورت اس کا رقص سرابوں میں دیکھا ہے

ڈھونڈ رہا ہے بے چارہ سُکھ چین وہ اپنا دوبارا
انساں نے آبادی سے پہلے جو خرابوں میں دیکھا ہے

جہل سے بڑھ کر جو عقلِ انسانی کو گمراہ کرے
ہم نے تو اس دَور میں ایسا علم کتابوں میں دیکھا ہے

عشق پہ کی تحقیق خرد کے ہر متداول پہلو سے
نہ یہ سوالوں میں پایا ہے، نہ یہ جوابوں میں دیکھا ہے

ہم نے وہ کیفیت تُجھ میں پائی جس کو یاروں نے
گاہ شرابوں میں چکھا ہے، گاہ گلابوں میں دیکھا ہے

میرے حوالے سے جس شخص کو سب نے جانا، میں نے تو
اس کو خیالوں میں سوچا ہے اس کو خوابوں میں دیکھا ہے

وہ بدلی کی ناؤ پہ اُڑتا چاند اکاش پہ تھا شوکتؔ
یا اک پھُول کنول جو تیرتا تالابوں میں دیکھا ہے

دریچہ بند ہے، کمرے میں روشنی بھی نہیں
ضرور ہو گا، مگر اب وہاں کوئی بھی نہیں

مرے ندیم ہے تو جس پہ ایسا آزردہ
وہ بات مَیں نے زباں سے ابھی کہی بھی نہیں

محبت اس قدر اے یار ہو تُجھے معلوم
نہیں تعلقِ خاطر تو دل لگی بھی نہیں

گذرتی جاتی ہے جو صُبح و شام بے مصرف
یہ زندگی ہے تو صاحب یہ زندگی بھی نہیں

بتاؤں میں تجھے خواجہ کہ دیس کی ہر چیز
مری نہیں ہے اگر یہ تو پھر تری بھی نہیں

جسے بتاتے ہو انسان دوست تم ایوبؔ
مرے تئیں تو وہ صحبت کا آدمی بھی نہیں

ہُوا ہے درپئے آزار کوئی کیوں شوکتؔ
کہ دشمنی تو کجا اُس سے دوستی بھی نہیں

دوست کو محرم بنا کر دشمنِ جاں کر دیا
تُو نے لے دل آپ بربادی کا ساماں کر دیا

لغزشِ آدم تو ہم تک آئی ہے میراث میں
دیوتا ہوتے، اسی خوبی نے انساں کر دیا

راز کو جتنا چھپایا اور افشا ہو گیا
تیرا چہرہ اور آنچل نے نمایاں کر دیا

مہرباں نے غم غلط کرنے کی رکھی یہ سبیل
جب پڑا ہے قحطِ مے تو زہر ارزاں کر دیا

اور پھیلی تُو سمٹ کر پھُول کے فانوس میں
تیرگی نے روشنی کو اور عُریاں کر دیا

کب زوال آیا ہے اپنی عقل پہ لیکن اسے
وسوسوں نے کند، اندیشوں نے حیراں کر دیا

اِک بیاباں میں ہوں شوکتؔ عندلیبِ نغمہ زن
شوق نے کن بد مذاقوں میں غزلخواں کر دیا

ہم عمر بھر بتا نہ سکے دل کا حال ہی
ہم درد ہی ملا نہ کوئی ہم خیال ہی

مقصودِ عشق ، ذوقِ طلب ، شوقِ آرزو
اس میں نہیں ضرور میسر وصال ہی

وحشت فزا ہیں شوق کے جذبے نئے نئے
ماخذ جنون کے نہیں اہلِ جمال ہی

حد سے بڑھا ہے علم اگر جہل بن گیا
شوریدگی ہے فرطِ خرد کا کمال ہی

زیرک ہوئے طیور اب ان کے شکار کو
درکار ہے زمین کا ہم رنگ جال ہی

منصف بنے نہ کھل کے مخالف کا مدعی
انصاف کا ذرا سا رہے احتمال ہی

شوکتؔ ہمارے دل کو خوشی خوش نہ رکھ سکے
اس کو ملول کر نہ سکے اب ملال ہی

عشق میں پست بہت ہمتِ عالی نکلی
غلط اُمید، وفا — خام خیالی نکلی

ہاتھ سونے کو لگایا تو ہُوا وہ مٹی
منہ تلک آئی صراحی تو وہ خالی نکلی

پھُول جب شاخ سے توڑا تو لہو ٹپکا ہے
کی جو تحقیق تو نیت تری مالی نکلی

لوگ ننگے تھے چڑھی قبر پہ لیکن چادر
لوگ بھوکے تھے مگر روضے سے ڈالی نکلی

اس جماعت کے سبب شہر میں پھیلا فتنہ
جو اٹھائے عَلمِ خیر سگالی نکلی

حسن کی شکل تھی اپنی بھی مگر جب فن سے
ہم نے محبُوب پہ کچھ اور نکالی، نکلی

ہم نے جس ایک کو جی جان سے چاہا شوکت
وہ کسی دوسرے کی چاہنے والی نکلی

خوش اسیری میں رکھے طبع کی افتاد ہمیں
کرنہ تو زلف گرہ گیر سے آزاد ہمیں

انفعالی وہی صورت ہے محبت کی سدا
قیس ہے لائق تقلید نہ فرہاد ہمیں

دل گرفتہ ہیں سرِ شاخِ شکستہ تنہا
درخورِ تیر سمجھتا نہیں صیّاد ہمیں

ہم جسے چھوڑ کے آئے ہیں جسے بھول چکے
لوگ بتلاتے ہیں کرتا ہے بہت یاد ہمیں

بدظنی ہی سے سہی، ذکر تو کرتے ہیں ترا
اچھے لگتے ہیں بہت گھر کے یہ افراد ہمیں

نغمے کو درد سے شرمندہ نہیں کر سکتے
ورنہ آتا ہے بخوبی فنِ فریاد ہمیں

وہ اگر دوست مسلّم ہے تو پھر اے شوکتؔ
اس سے کیا بحث رکھے شاد کہ ناشاد ہمیں

○

سو طرح ان پہ گہر افشانیاں رہ جائیں گی
اپنی جو باتیں یہاں انجانیاں رہ جائیں گی

رفتہ رفتہ بار پائیں گی شبستانوں میں یہ
باندیوں کے آگے بے بس رانیاں رہ جائیں گی

پھر اسی دل میں جہاں اٹھکیلیاں کرتے ہیں پھول
تم چلی جاؤ گی تو ویرانیاں رہ جائیں گی

تم اگر اک پھول دے دو طبع ہو جاتے گی سیر
لوگ بھر بھی دیں، تہی دامانیاں رہ جائیں گی

ہو کے وارفتہ کسی مجہول کو چُن لے گی وہ
ہوشمندوں کے لیے حیرانیاں رہ جائیں گی

چھوڑ جائے گا اگر وہ بے مروّت آشنا ــــ
دل کی دل سے سلسلہ جنبانیاں رہ جائیں گی

عقل کی باتیں تو شوکتؔ بھول جائیں گی تمام
یاد کچھ کچھ عشق کی نادانیاں رہ جائیں گی

کہیں اس میں مثالِ فاختہ ہو
مرے دل میں نوا پرداختہ ہو

یہ باہم دو دلوں کا مسئلہ ہے
جہاں ناحق خلل انداختہ ہو

کبھی میری طرح اللہ کرے تُو
کسی کے واسطے دل باختہ ہو

کبھی کیفیتِ دل زمہریری
کبھی حالت کہ گلخن آختہ ہو

نہیں ہے تخت یا تختہ مرا دل
وہ کیوں ڈر کہ یہاں سے تاختہ ہو

تجھے لازم ہے اے دل اس کے آگے
خموشی سے سپر انداختہ ہو

ملے جب والہانہ وہ طرحدار
تو شوکتؔ اک غزل بے ساختہ ہو

○

دل سے ناحق کرے نہ حسن گریز
اب اسے عشق سے ہوا پرہیز

بن گیا میرا نامۂ اعمال
کیوں تری لغزشوں کی دستاویز

آدمی تو ہے مجلسی مخلوق،
میرے ہم جنس، یارِ کم آمیز

یہ الگ بات اُگ رہے ہیں بُت
ورنہ خطّہ تو ہے یہ مردم خیز

ٹھیک منزل پہ آ پہنچتے ہیں
راستہ طے کریں جو سُست نہ تیز

منتشر ہوں تو قوس، نقطہ، خط
متصل ہوں تو جسم دلآویز

یہ حسِ ناطقہ کی ہے توہین
ہو نہ شوکتؔ جو بات فکر انگیز

○

پھول سوکھا ہو تو گلدان میں بھی کیوں آئے
اب مری یاد ترے دھیان میں بھی کیوں آئے

ناگواری مری وحشت سے اگر ہے تجھ کو
یہ تری زلفِ پریشان میں بھی کیوں آئے

جو تری ذات سے صحرا میں نہ مانوس ہُوا
وہ تجھے ملنے گُلستان میں بھی کیوں آئے

اَب نہیں ہے یہ اگر واقعی مطلق حیوان
سب خصائل وہی انسان میں بھی کیوں آئے

کوئی شے دسترسی ہو نہ میسر جس تک
آئے تو یوں حدِ امکان میں بھی کیوں آئے

میرے مُنہ سے نہیں جس لفظ کی اس کو برداشت
وہ شہِ وقت کے فرمان میں بھی کیوں آئے

شعر کا ٹوٹ گیا جس سے تعلق شوکتؔ
نام اس کا مِرے دیوان میں بھی کیوں آئے

پیار کے سُوت اکٹھے جو کبھی کاتے ہیں
ہم اکیلے اُنہیں بیٹھے ہُوئے سلجھاتے ہیں

ہم سفر کون یہ جانے کوئی رہ جائے کہاں
ساتھ چھوڑے نہیں جاتے ہیں، یہ چھُٹ جاتے ہیں

انجمن میں جنہیں رہتا ہے مرے دل سے گریز
ہو جو تنہائی مری ذات میں دَر آتے ہیں

اک غلط شخص کو چاہا ہے، خرابی ہو گی
ہم وہ سمجھے ہُوئے ہیں دوست جو سمجھاتے ہیں

اس زمانے میں کہ اپنے نہیں بنتے اپنے
شوکتؔ اک غیر کو ہم صدق سے اپناتے ہیں

○

ق

تھی اثر ہُوئی جاتی ہے شاعری میری
نشاط خیز نہیں لَے مرے ترانے کی
خدا مجھے مرے محبوب سے جُدا کر دے
مرے جنوں کو ضرورت ہے تازیانے کی

ذات ہی بنی منزل چل کے عمر کا جادہ
ہوں میں آپ ہی دلدار اور آپ دلدادہ

سوئیاں کسک کی خود جسم سے نکالو گی
وہ اُڑن کھٹولے کا آئے گا نہ شہزادہ

ثبت کر کے بھیجی ہے ہونٹ پر لگی سُرخی
اور سارا کاغذ ہے تہ شدہ، مگر سادہ

جوہری ذخیروں سے خوف تابکاری کا
کس طرح طبیعت ہو عشق پر اب آمادہ

ہر حصار زنداں کا شہر میں سلامت ہے
ہر مکان کے لیکن سقف و بام افتادہ

عدل کا ہُوا چرچا اب گلی گلی بار و
دار وا معلق ہے، یاں صلیب استادہ

جب نہیں ز روئے لفظ شوکت اور شے پانی
تو قسم ہے حافظ کی بادہ صرف ہے بادہ

میں نہیں کہتا طلسم اس میں مری ذات کا تھا
دوستی ترک نہ کی ، پاس کسی بات کا تھا

بے محابا رُخِ روشن پہ جو بکھرے گیسو
وقت دن کا نہ رہا ، گرنہ سماں رات کا تھا

ساقیا آنکھ سے یا لب سے پلائی ہوتی
جو خیال ایسا ہی رندوں کی مدارات کا تھا

دل ہے اس شخص سے کیوں ترکِ تعلق پہ مصر
دل کو جس شخص سے کیا شوق ملاقات کا تھا

آئنہ ہو گئے اک دُوسرے کے واسطے ہم
باہم اک ایسا زمانہ بھی حجابات کا تھا

وقت کا یوں بھی زیاں ہم نے کیا ہے اکثر
وہ بھی مسجد میں گذارا جو خرابات کا تھا

اب تو شوکتؔ کوئی مصرع بڑی مشکل سے ہو
ہاں مسلسل کبھی الہام غزلیات کا تھا

وابستہ ہو گئے ہیں قدم رہگذر کے ساتھ
ہم چل پڑے تھے ایک حسیں ہم سفر کے ساتھ

اک دن دھوئیں کی طرح نہ باہر نکال دے
ہمسایہ آبسا ہے بُرا میرے گھر کے ساتھ

گُلچیں پہ نکتہ چین نہ ہو، باغبان خود
گُل شاخ سے اُتار رہے ہیں ہُنر کے ساتھ

اس تیز گام شخص نے منزل کو جا لیا
جو ہر پڑاؤ پر نہ رکا راہبر کے ساتھ

دیتے رہے حساب کھڑے زاہدانِ خشک
بخشش ہُوئی ہے رند کی دامانِ تر کے ساتھ

پیشے کے اعتبار سے وہ سنگ بار ہیں
جو مدعی خلوص کے ہیں شیشہ گر کے ساتھ

اک خُوبرُو سے عشق میں سودا ہُوا ہے طے
دل کو بھی رہن کر دیا شوکتؔ نظر کے ساتھ

سب لوگ سرِ رہگذرِ وقت رواں ہیں
سب لوگ مگر درخورِ تاریخ کہاں ہیں

وہ شمع کہ ماضی کے دریچے میں دھری ہے
مستقبل و حال اس کے سبب نور فشاں ہیں

جو لوگ نگاہوں سے کبھی کے ہوئے رخصت
وہ لوگ — بدستور محیطِ دل و جاں ہیں

کیا زک ہمیں پہنچائیں گے یہ اہلِ زمانہ
ہم لوگ کہ بیگانۂ ہر سود و زیاں ہیں

سب بات ہے کہنے کی، نہ ہوں سامنے محبوب
تو دل میں کہیں بھی وہ یہاں ہیں نہ وہاں ہیں

ہم ہو گئے مجروح تو پھر کس کے لیے اب
احباب کمیں گاہ میں ناوک بہ کماں ہیں

شوکتؔ ہے یہی اپنی رہائی کا فسانہ
زنداں سے نکل آئے تھے پابندِ مکاں ہیں

○

کوئی آگیا بھول کر راستہ
کہ جا نکلا ہے آپ گھر راستہ

سبھی راہبر، راہرو تھک گئے
ہمارا رہا ہم سفر راستہ

کہاں کے ارادے سے نکلے تھے ہم
ہمیں لے کے آیا کدھر راستہ

بہ ہر گام سیراب کرتا گیا
سرابوں سے دشت نظر راستہ

افق سا لئے آئے منزل قریب
افق سا کرے دور تر راستہ

مناسب ہے ترکِ سفر ساتھیو
چلے لے کے واپس اگر راستہ

پڑاؤ پہ شوکتؔ لٹے قافلے
کہ آتے تھے طے پُر خطر راستہ

یاد آتا ہے، محبت میں وہ قائل ہو کر
رہ گیا تھا کوئی باہوں میں حمائل ہو کر

آنکھ ابھی ڈھونڈتی تھی اس میں کشش کا پہلو
دل مگر رہ گیا بے ساختہ مائل ہو کر

دل کی تو تیر نظر کھا کے ہے تیز اور اڑان
یہ پرندہ نہیں گرتا کبھی گھائل ہو کر

بعض اوقات تعلق میں ہوا ہے یہ بھی
دوست تک رہ گیا ہے دوست ہی حائل ہو کر

بہرِ دل بھی نہ کرے دستِ طلب کوئی دراز
دے نہ دستک درِ محبوب پہ سائل ہو کر

صدق، اخلاص، وفا، بلکہ محبت از خود
ہوں یہ جذبے تو اواخر، نہ اوائل ہو کر

شوکتؔ اک شخص نہیں جو مرا موضوعِ سخن
بے طرح حسنِ بیاں رہ گیا زائل ہو کر

ذرہ سمٹ کے مہرِ درخشاں میں بس گیا
قطرے کو اضطراب تھا طوفاں میں بس گیا

آگاہ دل میں ذوقِ تجسّس نے گھر کیا
شوقِ تماشہ دیدۂ حیراں میں بس گیا

دیر و حرم میں پائی نہ وسعت جو حسبِ ذات
یزدان بے کراں دلِ انساں میں بس گیا

ہم اُٹھ گئے تو ہو گئی ویران انجمن
ہم آ بسے تو شہر بیاباں میں بس گیا

وہ شخص جو ملا تھا سرِ رہ تکلفاً
کس بے تکلفی سے دل و جاں میں بس گیا

تو میرے دوست جا کے بھی مجھ سے ہے میرے پاس
یعنی تھا جس قدر ترے امکاں میں بس گیا

بخشی جو ہم نے فکر کو شوکت قبائے لفظ
وہ راگ بن کے لحنِ غزل خواں میں بس گیا

مسلسل گر کسی کو قلبِ مضطر یاد کرتا ہے
یہ کیفیت بھی اس کی کوئی اکثر یاد کرتا ہے

تمہارے ساتھ ہم کو تجربہ دونوں کا یکساں تھا
دلِ کم ظرف بھولا بھول، پتّھر یاد کرتا ہے

پڑے جب لالہ و گُل ماند تیرے عارض و لب سے
مرا ذوقِ تماشہ بیں وہ منظر یاد کرتا ہے

عبادت ثبت اس پر ہو گئی فی نفسہٖ جس سے
تمہارا آستاں وہ سجدۂ سر یاد کرتا ہے

حرم میں ہو ترا درویش یا دہلیزِ ایواں پر
ترا گھر یاد کرتا ہے، ترا در یاد کرتا ہے

ترے شاعر نے اب فکرِ سخن ہی ترک کر ڈالی
کہ ہر اک شعر یوں تھا جس طرح فریاد کرتا ہے

وہاں سے تم بہت آزردہ ہو کر آئے ہو شوکتؔ
چلو واپس چلو تم کو پشاور یاد کرتا ہے

○

چھوٹے چھوٹے بڑے بڑے ہیں یہاں
آپ بیٹھے ہیں، ہم کھڑے ہیں یہاں

دادِ منزل رسائی ان کو ہے
راستے ہی میں جو پڑے ہیں یہاں

عشق کی پختگی نہیں ملتی
کچّے پکّے بہت گھڑے ہیں یہاں

کس کی آمد ہے، دار کی مانند
کُو بہ کُو آدمی گڑے ہیں یہاں

بھُوک سے لوگ مر گئے لاکھوں
غلّے گودام میں سڑے ہیں یہاں

جھانکو اک دوسرے کی شکلوں میں
ہر طرف آئنے جڑے ہیں یہاں

کون گُلشن میں آگھُسا شوکتؔ
پھُول پھل بے طرح جھڑے ہیں یہاں

میں چلا جاؤں گا رہ جائے گا افسانہ مرا
ذکر کرتے ہی رہیں گے سب حریفانہ مرا

مے مجھے ممنوع، ساغر دسترس سے دور ہے
اور فرماتا ہے ساقی ہے یہ مےخانہ مرا

اب تو جانا ہی نہیں ہوتا ہے وعدہ گاہ میں
مدتوں تک یہ رہا معمول روزانہ مرا

کھینچتا ہے کون سا احساس اب اس کی طرف
ہو چکا ہے جس سے یکسر قلب بیگانہ مرا

بوریا موجود ہے، آنکھیں بھی فرشِ راہ ہیں
آئیے تو گھر ہے یہ حاضر غریبانہ مرا

کیفیت باہم محبت میں وہ سرشاری کی ہے
عاشقانہ ان کا طور، انداز جانانہ مرا

پوچھتا پھرتا ہے شوکتؔ کوئی میرے بعد اب
کیا ہوا، رہتا تھا یاں جو ایک دیوانہ مرا

بدن غلیظ ہیں، لیکن لباس فاخرہ ہے
یہی خلاصۂ تہذیب عہد حاضرہ ہے

کبھی بچاؤ بدن تم یہاں کبھی دامن
کہ اب ہمارا سگ و سنگ کا معاشرہ ہے

نہیں ہے عشق سے دونوں میں منحرف کوئی
دل و دماغ میں لیکن بپا مناظرہ ہے

دل و نظر میں سمائی ہے زینتِ فطرت زاد
کوئی حسینہ ہمیں مومنہ نہ کافرہ ہے

یہ تیرے لہجے میں ڈھل کر بنے گی موسیقی
غزل کلاسکی کا مود ہے نہ دادرہ ہے

ہر ایک شخص ہوا ہے شریکِ ھنگامہ
برائے امن و اماں شہر میں مظاہرہ ہے

ہے شوکتؔ ایک ریاکار شیخ کو تکلیف
کہ مدرسہ میں بپا محفلِ مشاعرہ ہے

اس مہرباں نے چاند یا سورج تو کیا دیئے
دو اک دیئے تھے شہر میں وہ بھی بجھا دیئے

منڈی میں اب لگے گی نمائش بہار کی
گل چین اہلِ باغ نے مالی بنا دیئے

ظالم نے جسم قید سے آزاد کر دیا
پہرے زبان و ذہن پہ لیکن بٹھا دیئے

واعظ کو خود عمل کی نہ توفیق ہو سکی
ہاں وعظ روز روز دیئے جا بہ جا دیئے

بچے ہیں، کچھ لحاظِ سن و سال کیجیئے
اتنا نہ بوجھ ان پہ کتابوں کا لادیئے

ہم جس کی عافیت کی دعا مانگتے رہے
ہم کو اسی حبیب نے صدمے سوا دیئے

چاہی تھی داد اس نے ستم کی وثوق سے
شوکتؔ بڑے خلوص سے ہم مسکرا دیئے

―

حالِ دل کہنا سنانا ہے بڑی مشکل کی بات
بات ہے حق کی اسے سارے کہیں باطل کی بات

دور ساحل پہ کھڑا مجھ کو سنائے جاتے ہے
حسبِ معمول آشنا عافیتِ ساحل کی بات

رہنماؤں کا فریبِ خاص دیکھا چاہیئے
آئے لے کر کس جگہ کہ کے یہ کس منزل کی بات

یہ ادھار اور نقد کا کوئی بہی کھاتہ نہیں
دوستداری ہے حسابِ دوستاں در دل کی بات

کہ دیا بے دردنے پہلے فردِ دل کا چراغ
پھر یہ فرمایا مجھے کہ گرمیٔ محفل کی بات

آدمیت قتل ہو جاتی ہے دونوں ہی طرف
ہے یہ اک مقتول کا قصہ، نہ اک قاتل کی بات

شعر شاعر، نغمہ نغمہ گر بنے، بُت بُت تراش
فن میں شوکتؔ صرف یہ ہے ماخذو حاصل کی بات

―――――

کب مجھے ضد ہے کہ چاند ابھرے ستارا نکلے
کسی جگنو ہی سے دم بھر کو شرارا نکلے

اس قدر بھی نہیں مایوس ہوں اہلِ کشتی
شاید اُمڈے ہُوئے طوفاں سے کنارا نکلے

ان کن انکھیوں کے کنائے کو ذرا دھیان سے دیکھ
لب نہ جو کہہ سکیں شاید وہ اشارا نکلے

لوگ بیٹھے رہے ہنگامِ کشاکش گھر میں
جب کسی نے بھی مدد کو نہ پکارا، نکلے

وہ جو بے عزم رہے یارِ مددگار کے ساتھ
کسمپرسی میں بڑے صاحب یارا نکلے

جس کی تعبیر حسیں کی ہے، بشارت تم کو
لطف آجائے جو وہ خواب ہمارا نکلے

منحرف خود سے نہ اتنا ہو مبادا شوکتؔ
جس پہ تکیہ ہے وہ کمزور سہارا نکلے

ہر چند کوئی شخص محبّت سدا کرے
ہر لحظہ تاہم از سرِ نو ابتدا کرے

وہ قرضِ دل ہے پیار مرے خوش معاملہ
تا عمر ادا نہ ہو، کوئی تا عمر ادا کرے

خواہش ہے وہ بلا کہ بجز سیر چشم یہ
سب کو معاشرے میں بسانِ گدا کرے

آیا ہے اب ترقیِ معکوس کا وہ دَور
بس کہ نمازیوں کا اِمام اقتدا کرے

یہ غضب ہے غضب، متولّی مزار میں
شامل اگر پڑوس کا برآمدہ کرے

مصرف یہ رہ گیا ہے کتابوں کا اِن دنوں
ہر طفل پر یہ بوجھ بہ مکتب لدا کرے

شوکتؔ سخن کا ذہن پہ ایسا عمل تو ہو
گنبد میں بازگشت کہ چندے صدا کرے

یوں نہ ہو دل مضطرب اے جانِ جاں تجھ بن نہ ہو
بات وہ ہو جائے ممکن جو کبھی ممکن نہ ہو

کام بن جاتا ہے اکثر بے دلانہ گر کریں
مخلصانہ سعی سے چاہیں کبھی لیکن نہ ہو

آدمی میں آدمیّت کی تو خوبی چاہیئے
آدمی بے شک فرشتہ، دیوتا یا جن نہ ہو

ہے بہت بیمار میرے دل مرا تیمار دار
مبتلا اپنے مرض میں دیکھ ابھی کچھ دن نہ ہو

میں شناسا آشنا محبوب کی کہتا نہیں
دوست شوکت بن نہیں سکتا اگر ہم سن نہ ہو

شعر

عمر بھر ڈھونڈنے کے بعد ملا آخر کار
ہم طبیعت بھی وہ اک شخص کہ ہم سن نہ ہوا

○

معاشرے کا شعار ایسے انتشار میں ہے
ہر ایک آدمی میدانِ کار زار میں ہے

جو دائیں بائیں ہیں ان کو دھکیل کے بڑھ جا
وہ رہ گیا جو یہاں قاعدے قطار میں ہے

رہا نہیں کوئی دشمن کی گھات میں دشمن
کہ دوست کو تو مزہ دوست کے شکار میں ہے

ملے گی حکم کی تاویل دیں سے برجستہ
فقیہہ حلقہ بگوشانِ شہر یار میں ہے

رہا تو ہو گئی آسیب سے یہ دوشیزہ
پہ اب بھی حضرتِ عامل ترے حصار میں ہے

بہار تھی کبھی پھولوں کے دم سے، پر اب تو
وجود اس کا گریبانِ تار تار میں ہے

رہی نہ اب کوئی بے گانگی میں خاصیت
خصوصیت کی کوئی بات ہی نہ پیار میں ہے

اسے یہ زعم کہ اُٹھ بھی گیا کنار سے وہ،
مجھے یہ وہم وہ اب تک مرے کنار میں ہے

فن اور بوقلموں چاہیئے کہ اے شوکت،
یہ وہ کمال ہے جو دستِ کردگار میں ہے

○

دو شعر

لوگ حالات سے جو خوف زدہ ہوتے ہیں
سُوئے دیر و حرم و بادہ کدہ ہوتے ہیں

دانت سے کھُل نہیں سکتی جو پڑے دل میں گرہ
تن نہیں خارِ مژہ جاں خلدہ ہوتے ہیں

○

لفظ اظہار کی صُورت جو قلم پر اترے
اپنی ہی ذات کی رفعت سے یہ ہم پر اترے

زندگی عشق کے دشوار سفر میں گذری
وادیٔ دل میں پھرے ، منزلِ غم پر اترے

حیرت آتی ہے ، یہ نے صرف جو محتاج ترے
وہ نہ پُورے ترے معیارِ کرم پر اُترے

یہ چہرہ ہر کیفیتِ ذہن کا دیباچہ ہے
فرطِ بہجت پہ کھلے ، فرطِ الم پر اترے

حیثیت میں جو بڑھے لوگ تو اکثر یہ ہُوا
آدمیّت میں وہ پیمانۂ کم پر اترے

ایڑ دی اور رہوا ہو گئے کچھ حوصلہ مند ،
کچھ وہ ، گھوڑوں پہ چڑھے چند قدم پر اترے

منہدم کی گئی مسجد تو روا ہے غصہ
پر نہ اتنا کہ یہ مندر میں صنم پر اترے

بن کے بھی حاکموں کے هم ہدفِ مشق زنی
کمتر اندازۂ اندازِ ستم پر اترے

اے مرے وعدہ شکن میں نہ رہوں چشم براہ
اعتبار ایسا ترے قول و قسم پر اترے

بڑھ گئے ہم کہ وہاں سے ملا راستہ آگے
دیر کے پاس رُکے ہم نہ حرم پر اترے

جرأت اب بھی ہے سکت جاتی رہی ہے شوکت
اک پرندہ ہوں کہ سب ہو گیا نم، پر اترے

قطعہ

اس کے چہرے پہ اک چمن دیکھو　　لہلہاتے گُل و سمن دیکھو
یہ تناؤ دکھاؤ کوہ بہ کوہ　　یہ بناؤ دمن دمن دیکھو

ہے یہ زیادہ تو، ہے اگر کم تو، لکھ چکے
چاہے پڑھ اب اسے کہ نہ پڑھے، ہم تو لکھ چکے

اِک لمحہ آج آیا ہے بہرِ سُخن، سُنو
ہم قابلِ مطالعہ ہر غم تو لکھ چکے

بارے بیاں شکستگیٔ حوصلہ بھی ہو
سو بار حالِ عزمِ مصمّم تو لکھ چکے

تحریر چاہئے جو عبارت ستم سے ہے
تفصیل مہر بانیٔ ہمدم تو لکھ چکے

اب دل کی اور کونسی ہو کیفیت رقم
اس کے وصال و ہجر کے موسم تو لکھ چکے

قاصد ہو غیر شخص تو لکھیے جواب بھی
ہو نامہ بر حبیب کا محرم، تو لکھ چکے

پہنچا ہیں اور کیسے کسی تک پیامِ دل
پیہم تو کہہ چکے ہیں، یہ پیہم تو لکھ چکے

اللہ وطن میں امن رہے، گرچہ فال ہیں
یہ زائچے میں درہم و برہم تو لکھ چکے

گالوں پہ آنسوؤں کے نگارش طراز ہوں
شوکت فسانۂ گُل و شبنم تو لکھ چکے

○

دو شعر

شہرت الفاظ کے انبار سے ہاتھ آتی ہے
صرف اک لفظ سے گاہے یہ چلی جاتی ہے

○

رات کے گال پہ چاند کا ہالا
اک حبشن کے کان میں بالا

○

مٹّی میں ہزار دل ملے ہیں
جب پھول کہیں کہیں کھلے ہیں

جس حال میں زندگی گذاری
اے دل یہ ترے ہی حوصلے ہیں

گویا ہے اُنہیں عزیز بھی تُو
اے دل تجھے اُن سے یوں گلے ہیں

اے راہزنو! کمیں میں رہنا
رستے میں کچھ اور قافلے ہیں

طے چاہئیں باہم آشتی سے
اچھّے کہ بُرے مُعاملے ہیں

شوکت یہ جہاں یہ جاں یہ جاناں
غم کے بھی دراز سلسلے ہیں

کوئی بھی ہو تو ہم کریں طے
کیسے یہ دلوں کے فاصلے ہیں

—

فردِ فرد، لخت لخت

○

دیکھنا چاہیئے اڑنے کا تماشا اس وقت
پہلے اک ننھے پرندے کے جو پر آتے ہیں

اطلس و ریشم و حریر میں بھی آدمی بے لباس رہتے ہیں
یہ علاقہ ہے وہ جہاں شوکتؔ آدمی ناشناس رہتے ہیں

دیارِ اہلِ گراں گوش میں ہمیں شوکتؔ
سخن کے واسطے بے فائدہ زبان ملی

رُخ سے آگے بھی ہیں تیری ذات کی رعنائیاں
پھول میں کب سارا مضمونِ بہار آنے لگا

ثبوتِ حق کے لیے یہ تضاد لازم تھا
بس اس خیال سے ہم نے صنم نہیں توڑے

اے دوست میرے عشق پہ تنقید کر ضرور
لیکن یہ سوچ کہ یہ تری آبرو نہ ہو

ذوقِ پرواز نہیں رکھتے ہیں پرپرندوں کے کترنے والے

ملنے لگے ہیں صورتِ یارانِ صاف دل
جب زیر کر سکے نہ ہمیں دشمنی سے لوگ

رسم و رہِ خلوص زمانے سے اُٹھ گئی
بدظن ہوا ہے جس سے محبت کی بات کی

ظالم گرا کے گھر مرا دے حکم مجھ سے ہی
بیگار بھی لیں ملبہ اُٹھانے کے واسطے

بڑے حساب سے ہوتے ہیں بے تکلف دوست
کوئی کسی کو نہیں والہانہ چاہتا ہے

عمر بھر ہم نے کیا ہے اس گھڑی کا انتظار
اے مرے زود آشنا۔ کچھ تو ٹھہر، کچھ تو ٹھہر

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ محبت کیا ہے
اب یہ خواہش ہے کہ ہو تجھ کو تمنا میری

مجھ سے خدا بھی روٹھ گیا جیسے تیرے بعد
وہ آسماں کو چل دیا تو اپنے گھر گیا

تو اس قدر وثوق سے عہدِ وفا نہ باندھ
تو اس قدر خلوص سے مل کر نہ پیار کر

وہ بُت جو ہم نے تراشے تھے طاقچوں کیلئے
بلائیں بن کے ہمارے گلے کا ہار ہوئے!

دل تمہیں اس لیے کہتا ہے خوشی سے رخصت
جا کے دل ہی تو کوئی اور کروگے آباد

جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی شوکتؔ
ہم نے جب شہرِ پشاور میں قدم رکھا تھا

ع : کرنا پھوٹا، رستے مہکے، بادِ پشاور آتی ہے

بھئی شہرت تمہارا شکریہ لاہور بھی دیکھا
خدا رکھے پشاور کو پشاور پھر پشاور ہے

قائم ہے پشاور سے محبت وہی شوکتؔ
دُکھ گرچہ بہت اھلِ پشاور نے دیئے ہیں

وہم بھی گذرا نہ تھا اس درجہ تنگ آئیں گے ہم
چھوڑ کر شوکتؔ پشاور کو چلے جائیں گے ہم

تہ بہ تہ بھی کئی دل ہوتے ہیں باور آئے
ہاں مگر شرط ہے یہ کوئی پشاور آئے

سچ کو تو قتل نہیں کر سکتے
زہر سقراط کو دینے والے

طرّے بڑھا کے آئے جو قامت پہ کچھ بزرگ
وہ اصل قد میں اور بھی کوتاہ ہو گئے

بنتی نہ ترے گیسو و قامت کی حکایت
ہم لوگ جو ذکرِ رسن و دار نہ کرتے

شعر

رات میں ڈوب گئی ہے جو شفق پھولی تھی
رائیگاں پی گئی تاریخ شہیدوں کا لہو

ہو گوش بر آواز کہ گزرے ہُوئے لمحے
اِک ساز کے پردے میں کوئی ٹانک رہا ہے
دیکھو مِرے دیوان کے ہر ایک ورق پر
ماضی کے دریچے سے کوئی جھانک رہا ہے

مُصنّف کی دیگر تصانیف

۱ جلترنگ ۔ (گیت)

۲ شیشۂ ساعت ۔ (غزلیں)

۳ اشکِ آتش ۔ (مثنوئ پاکستان)

۴ کوئے مغاں ۔ (نظمیں)

۵ کوئے بتاں ۔ (رومانی نظمیں اور سراپا)

۶ ذوقِ خامہ ۔ (غزلیات)

۷ یاد آتی ہے راہی کو ۔ (منظوم سفرنامہ)

۸ قلم کا قرض ۔ (اُردو میں پہلا طبع زاد رزمیہ)

عالمی ادب عالیہ کے منظوم تراجم

(ا) فردوس گمُ گشتہ ۔ (پیراڈائز لاسٹ ـــــ ملٹن)

(ب) کربیہ طربیہ (ضربیہ، برزخیہ، فردوسیہ) ڈیوائن کامیڈی ڈانٹے مکمل تین حصے

(ج) المیہ حکیم فسطاس ۔ (ٹریجک لائف آف ڈاکٹر فاسٹس ۔ کرسٹو فر مارلو)

(د) آشوبیہ ۔ (ایلیڈ ۔ ہومر) پہلے چھ دفتر

(ر) راگ کی آگ (گیتا نجلی ۔ ٹیگور)

کہتا ہوں سچ ـــــ (آپ بیتی)

فردوس گمُ گشتہ ۔ دوسرا ایڈیشن (مع فرہنگ) (زیرِ طبع)

کہتا ہوں سچ ۔ دوسرا ایڈیشن (مع ترمیم و اضافہ) (زیرِ طبع)